نئے ناقوس میں پھونکی پھر جسنے روح وہ میں ہوں
ابھی موجود ہیں اہل کلیسہ دیکھنے والے

سوانح نورجہان بیگم

یعنے

شہنشاہ جہانگیر کی ملکۂ محبوبہ کے محقق اور صحیح حالات اور مشہور عالم سوانحعمری

جسے

ابو الفضل مولوی شیخ عاشق حسین صاحب سیماب صدیقی الوارثی اکبرآبادی

نے تالیف کیا اور

باہتمام ایس۔ ریاض الدین
الیکٹرک ابوالعلائی پریس آگرہ مین چھاپا گیا

نئے ناقوس میں پھونکی پھر جسنے روح وہ میں ہوں
ابھی موجود ہیں اہل کلیسہ دیکھنے والے

سوانح نورجہان بیگم

یعنے

شہنشاہ جہانگیر کی ملکۂ محبوبہ کے محقق اور صحیح حالات اور مشہور عالم سوانحعمری

جسے

ابوالفخر مولوی شیخ عاشق حسین صاحب سیماب صدیقی الوارثی اکبرآبادی

نے تالیف کیا اور

باہتمام ایس۔ ریاض الدین
الیکٹرک ابوالعلائی پریس آگرہ مین چھاپا گیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہو گئیں

بدنصیب ہندوستان اُسوقت دیکھنے اور سیر کرنیکے قابل ہوگا جب اسکے
مختلف باغوں میں مختلف ممالک کے تازہ اور شاداب پھول ہر طرف لہلہا
رہے ہونگے۔ اونکی خوشبوئے مشام انگیز سے دماغ عالم معطر و معنبر ہوگا خصوصاً وہ پھول
جو فطرتاً لطیف اور نازک ہونگے اپنی لطافت و نزاکت کی جلوہ ریزی میں اپنا جواب نہ
رکھتے ہونگے۔ اونہیں پھولوں میں سے نورجہاں بھی ایک پھول تھی جسکی تازگی اور لطافت
گلکدۂ تاریخ کے اوراق پریشان پر ہنوز بہار آفریں ہے ؎

خزاں ہوا گلشن شگفتہ نشان کچھ نہیں مگر ہے باقی　　زمیں پہ باد گلوں کی لطافت ابھی شگفتہ ہی ہے

نورجہاں کی کئی سوانح عمریاں قابل اور لائق انشا پردازان ملک نے لکھی ہیں
نیز مغربی سیاحوں اور مورخوں نے نورجہاں کی لائف پر کافی روشنی ڈالی ہے لیکن
جسطرح رخسار یار کو صرف گلاب و ماہتاب کہدینے سے تسلی نہیں ہوتی اور جی چاہتا
ہے کہ کوئی اور حسین تشبیہ دیجائے اسیطرح طبیعت تقاضہ کرتی ہے کہ نورجہاں
کے ذکر سے گو بیشتر صحائف مزین ہوچکے ہیں پھر بھی اوسکا ذکر جمیل ہنوز جاری رہے
تو اچھا ہے ؎

کر چکا ہوں ذکر تیرا اور کرونگا پھر بہت ہم جلیس کنج تنہائی اسے پاتا ہوں میں

نورجہاں کی لائف سے جو نتائج اور سبق ہمیں حاصل ہوتے ہیں وہ اگر بہ نگاہ انتخاب دیکھے جائیں اور ان پر تعصب سے الگ ہو کر تنقید کیجائے تو انسان کی ہستی کا راز اور بدیہات فطرت کے اسرار سے پردہ اٹھ سکتا ہے۔ اس لائف سے قدرت قادر کا اختیار کامختصر شمع ہے اور فطرت انسانی کے جوہر کلیۃً جلوہ گر ہیں۔ انسان اپنی قسمت کے مستقبل سے اسیطرح بےخبر ہے جسطرح وقت تخلیق سے قبل علم الاشیاء اور وقوف ہستی سے نیز اپنی حالت واقعیہ سے بےخبر آگاہ و بے وقوف تھا آپ اس لائف میں ملکہ کی پیدائش، اور شاہانہ طرز آسائش صبر کی آزمائش اور پردۂ حسن سے عشق کی نمائش دیکھیں گے تو آپ کو قدرت الٰہی کے وہ مناظر نظر آئینگے جن کا نظارہ آپکی چشم باطن میں چکاچوند پیدا کر دیگا ؎

پھولے نہ سمائیں تو ہر ایک رنگ ہے تاریخ چمن لکھنے والے نے کوئی بات اٹھا نہ رکھی ہے

سوانح نگاری سے جسقدر ہندوستان میں دلچسپی بڑھتی جاتی ہے اسیقدر سوانح نگاری میں بھی ترقی ہوتی جاتی ہے لیکن آج کل کسی قسم کی سوانح عمری لکھ کر [illegible] پیش کرنا خالی از خطر نہیں ہر مصنف یا مولف اپنے علم کے زعم میں دوسروں کی تالیفات و تصنیفات میں عیوب چینی کے لئے تیار ہے اور ایسی نگاہیں بہت کم ہیں کہ اچھی چیز کو انتخاب کرلیں اور بری چیز کو چھوڑ دیں۔ خذ ما صفا ودع ما کدر پر عمل کرنیوالے مقدس نفوس دنیا میں عموماً اور ہندوستان میں خصوصاً بہت کم ہیں ابھی ایک تصنیف یا تالیف کو میدان اشاعت میں نمودار ہوئے پہلا دن ہوتا ہے کہ اس پر چاروں طرف سے اعتراضات کی بوچھار ہونے لگتی ہے۔ فرمایئے لکھنے والوں کا دل

کیونکر بڑہے ؎ تم تو ذکرِ وصل کرتے ہی خفا ہونے لگے
داستانِ شوق سن لوگے تو کیا ہو جاؤگے

سوانح نگار جن واقعات کو مرتب کرتا ہے وہ عموماً افسانہ ہائے پیشین سے لئے جاتے ہیں آرائے کا اختلاف دوسری بات ہے کہ مصنف و مولف کی رائے جدا جدا ہوتی ہے۔ ایک ہی واقعہ ایک صاحب الرائے کی نگاہ میں اچھا اور دوسرے کی نظر میں معیوب نظر آتا ہے۔ مگر یہ اپنا اپنا خیال اپنی اپنی تحقیق اور رسائی ہے۔ مخالف آرا سے بُرا ماننا بڑی بات ہے کہ سوانح نگار کوئی واقعہ اپنی طرف سے گڑھ کر لکھ نہیں سکتا لکھے گا وہی جو اس تک روایات کے ذریعہ سے پہنچا ہے پس واقعات کی عمومیت مولف کے علمی تجربہ سے ذرا بھی مستغنی نہیں کرتی۔

یہ سوانح عمری جو اسوقت آپ کے ہاتھ میں ہے تمام دوسری سوانح عمریوں سے بہر نوع و بہر صورت مرجح ملے گی اور زبان کی چاشنی سے جو لوگ لذت آشنا ہیں وہ یقیناً اس ترتیب شیریں کی داد دیں گے۔ کہ جو لطف بیان آپ کی زبان میں ہے وہ دوسری زبانوں کو نصیب نہیں ؎

ہزاروں سے سنے یہ لفظ لیکن لفظ تھے خالی
تمہاری بات کی شوخی تمہاری ہی زبان تک ہے

آگرہ
سیماب

۲۰ - فروری ۱۹۲۰ء
صدیقی الوارثی اکبرآبادی

نورجہاں

نورجہاں کے جد امجد جنکا نام خواجہ محمد شریف تھا طہران کے ایک زبردست عالم و فاضل امیر کبیر تھے اور ننہال میں بھی امارت و فضیلت کی کچھ کمی نہ تھی خواجہ محمد شریف محمد خاں تکلو حاکم خراسان کے دربار میں بعہدہ وزارت مامور تھے پھر جب خاندان صفوی ایران پر قابض ہوا تو یہ ھرو کے گورنر بنا دیے گئے۔ عمر نے بیوفائی کی تاج وزارت سر پر رکھے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ پروانہ قضا آپہنچا جنت میں انکی طلبی ہوئی اور یہ دار فنا کو خیرباد کہہ کر دار البقا کی طرف روانہ ہو گئے خواجہ محمد شریف کے دو بیٹے تھے۔ آقا طاہر اور مرزا محمد غیاث۔ مرزا محمد غیاث کو لوگ آنکھوں میں جگہہ دیتے تھے لیکن محمد شریف کے قضا کرتے ہی ان کی بہت وجاہت وامارت زمین اور حسود کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی۔ مرزا غیاث نے ہر چند کوشش کی کہ لوگوں کے خیالات ان کی طرف سے صحیح ہوں لیکن یہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکے اور حاسد دل نے سریر آرائے سلطنت کے کان ان کی طرف سے ایسے بھرے اور اسقدر بار قرض خواجہ محمد شریف کے ذمہ نکالا کہ مرزا غیاث حیران ہو کر رہ گئے۔ لاکھوں روپیہ کا قرض زمانہ ناموافق سلطنت بدظن، زمین تنگ آسمان دشمن، کیا کریں کیا نہ کریں۔ یہ بیچارے اسی کشمکش میں تھے کہ انکی جائداد منقولہ وغیر منقولہ کے ضبط کرنیکا سرکاری حکم پہنچا اور یہ دم بھر میں بے خانماں ہو گئے۔ مرزا محمد غیاث کی شادی مرزا علاؤ الدولہ پسر آقا ملا کی دختر نیک اختر عصمت النسا بیگم سے ہوئی تھی اور اسوقت تک دو لڑکے اور ایک لڑکی آپ کے

بطن سے پیدا ہو چکے تھے چوتھا بچہ پیٹ میں تھا کہ اتفاقاً سلطنت نے جلاوطنی کا حکم دیا۔ اور کہلا بھیجا کہ ایران چھوڑ کر فوراً ہندوستان روانہ ہو جاؤ۔

ایک تو گل سے جدا رکھا مجھے صیاد نے
اوس پہ یہ تاکید اڑ جاؤ نشیمن چھوڑ کر

حکم حاکم مرگ مفاجات، تنگ آمد سخت آمد۔ مرزا غیاث بحالت مجبوری تھوڑا سا سامان خورد و نوش لیکر معہ اپنی غمگسار بیوی کے ہندوستان کی طرف روانہ ہو گئے۔ چھوٹے بچے ہاتھ تھامے ہوئے ساتھ تھے اور انقلاب ہمرکاب تھا۔

ایران کے شگفتہ پھول خارزار قندہار میں

لے چلی وحشی بنا کر فتنہ سامانی مجھے
رونیگی اب تا قیامت خانہ ویرانی مجھے

وہ مرزا غیاث جو شبستان وزارت کے ایک روشن چراغ تھے اور وہ عصمت النسا بیگم جو شاہی محلوں کی رانی تھیں ایک قافلے کے پیچھے پیچھے اپنی بیکسی اور بے بسی پر آنسو بہاتی ہوئی کبھی اونٹ پر اور کبھی پیدل چلے جا رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے نادان بچے جنھوں نے پیادہ پائی کی مصیبت اس سے پہلے کبھی نہ اٹھائی تھی۔ اپنے ماں باپ کا منہ دیکھتے تھے جب تھک جاتے تھے تو رو دیتے تھے عصمت النسا بیگم کی وجہ سے اور بھی مجبور تھیں۔ اس پر سفر کی مصیبت آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور پاؤں ورم کر آئے تھے۔ بار بار آسمان کی طرف دیکھتی تھیں اور کہتی تھیں۔

اے آسمان ستا نہ دلِ زار کو مرے
بے خانماں ہوں اور غریب الوطن نہیں

صحرائے قندھار کی دشوار گذار وادیوں کے شروع ہوتے ہی عصمت النسا کے
پیٹ میں دردِ زہ بھی شروع ہوگیا۔ یک نہ شد دو شد۔ بیچاری ایک درخت کے
نیچے گھبرا کے بیٹھ گئی۔ اور درد کی وجہ سے بیتاب ہونے لگی۔ مرزا غیاث نے
تسلی و تسکین میں کمی نہ کی لیکن سنسان جنگل کی بھیانک رات! درندوں کا شور
چوروں کا خوف یہ ایسی باتیں تھیں جو عصمت النسا کو مطمئن نہ کرسکیں۔ غریب
روتی تھی اور دل میں خیال کرتی تھی کہ ایک دن میں چاندی اور سونے کی مسہری
پر آرام کرتی تھی بیسیوں کنیزیں میری خدمت کیلئے تیار رہتیں۔ آرام کے
تمام سامان میرے لئے ضرورت سے زیادہ موجود تھے۔ میری ہر تکلیف خیال
کرتے ہی ایک ذرا سے اشارہ پر راحت سے بدل جاتی تھی۔ اگر میرے پھانس
چبھتی تھی تو میرے ہوا خواہوں کے دلوں پر چھریاں چل جاتی تھیں لوگ میرے
پسینہ کی جگہہ اپنا خون گراتے تھے اور آہ! ایک دن یہ ہے کہ اس لق ودق
جنگل میں بے یار و مددگار مبتلائے درد ہوں اگر میرے لئے کوئی فرش ہے تو
جنگل کی خشک و زرد گھاس اچتر ہے تو آسمان کی نیلی چادر میرے مونس و ہمدم
جانور ہیں اور بیکسی کے سوا کوئی غمخوار نظر نہیں آتی۔ یا آج کسی درندے کو
ہی بھیج دے کہ کسی غار سے نکلکر میرا کام تمام کرڈالے۔ یا آسمان سے کوئی بجلی
گرکر میرا فیصلہ کردے۔ ادھر مرزا غیاث نے اندھیری رات میں الاؤ جلا رکھا تھا
بچّوں کو اپنے پاس بٹھا لیا تھا اور اپنی گذشتہ و آئندہ حالتوں پر نظر تنقید ڈال

رہا تھا بیوی کی بیکسی بچوں کی تکلیف اور اپنی خانہ بربادی کے خیال سے اُسکا
دل بیٹھا جاتا تھا۔ مگر اوس کی مایوسی دعائیں مانگ رہی تھی۔ کبھی کبھی اوسکے
دونوں ہاتھ جانب آسمان اوٹھ جاتے تھے اور وہ چلانے لگتا تھا سے

الٰہی رحم کن بر حال زارم | کہ از مایوسی خود بے قرارم
نگاہِ لطف بر بیچارگاں کن | مسرت از در قدرت عیاں کن

جب اوسکی بیقراری حد سے زیادہ بڑھ جاتی تھی تو انبیاء علیہم السلام کی مصیبتیں یاد
کرکے وہ اپنے دل کو ڈھارس بندھاتا اور اپنی بیوی کو بھی سمجھاتا تھا کہ وہ خدا جس
نے مریم علیہا السلام کی مدد کی تھی تمہاری بھی مدد کریگا۔ وہ اس واقعہ کو بار بار
پڑھتا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام بھی اپنی حاملہ بی بی کے ساتھ اسی طرح لق ودق
جنگل میں آئے تھے۔ مگر انوار الٰہی نے اون کی پیشوائی کی اون کی زحمتوں کو نوازا
اور انہیں اُسی عالم تردد وافکار میں ایک تسکین بخش ندائے غیبی کے ساتھ خلعت
نبوت بخشا۔ وہ اپنے انجام کار کی بہتری کا یقین رکھتا تھا اور یاس کے
مناظر کو اپنے سامنے سے ہٹانا چاہتا تھا۔ مگر پھر بھی غریب الوطنی کے جذبات ویران
اوس کے آنسوؤں کو حرکت میں لے آتے تھے: چاند اپنی پوری روشنی کے
ساتھ فضائے عالم کو منور کر رہا تھا جنگل کا ذرہ ذرہ نوری لباس میں چمک
رہا تھا۔ درخت جھوم جھوم کے غافل انسان کو خدائے قیوم کی پوشیدہ
نعمتوں کا مژدہ سنا رہے تھے۔ کہ پچھلے پہر پردہ شب کی تاریکی میں عصمت
عصمت النسا بیگم نے وضع حمل کیا اور نو نہال پیدا ہوئی۔ اس عالم بیچارگی
میں لڑکی کا پیدا ہونا ایک دوسری مصیبت تھی ہر زیا غیاث اسکی پیدائش

سے کچھ خوش نہ ہوا۔ اور سوچا کہ نہیں تو قسمت خدا جانے کہاں کہاں لئے
پھرے گی اور ہماری آوارگی کا انجام خدا جانے کیا ہوگا اس لڑکی کو ساتھ
ساتھ لئے پھرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے۔ کہ اسی
جنگل میں چھوڑ دیا جائے اور یہاں سے آگے کی راہ لیں یہ ارادہ اوس
نے اپنی بی بی پر بھی ظاہر کیا۔ ماں کی مامتا کو کون نہیں جانتا ۔ وہ گو کیسی
[illegible] میں تھی مگر شوہر کے اس ارادہ کو سنکر بیقرار ہو گئی - اور اس کی
آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے ۔ دنیا میں کون سی ماں ایسی ہوگی
جو اپنی چھاتی پر پتھر کی سل رکھہ کر اپنے دل کے ٹکڑے کو جنگل میں چھوڑ دیگی مگر
شوہر کی فرمانبرداری کا احساس اس سے بھی زیادہ تھا۔ مجبوراً اُسے مرزا غیاث کی
رائے پر عمل کرنا پڑا۔ ماں نے ایک دن کی جان کو اسی درخت کے نیچے نرم نرم پتوں
پر لٹا [illegible] کپڑے سے اوسکا جسم ڈھکا۔ اپنے ہاتھ کی انگوٹھی اسکے گلے میں ڈالی
اور کہا [illegible] تیرا خدا حافظ ہے۔ میں تجھے چھوڑ کے جاتی ہوں - مجبور ہوں ،
مصیبت زدہ ہوں خدا تجھ پر رحم کریگا تیری حفاظت اسی کے اختیار میں ہے
وہ ہزاروں بچوں کو اسی طرح پالتا ہے تجھے بھی پالیگا ۔ بچی اپنی ماں کو اگر زندہ
رہے تو بیرحم اور ظالم نہ ٹھیرانا ۔ کہ میں اپنی مصیبتوں سے خود ہی پریشان ہوں ۔ یہ کہا
ایک دفعہ اور اوسے دودھ پلایا - اور "فی امان اللہ" کہتے ہوئے ماں باپ
دونوں وہاں سے رخصت ہو گئے ۔ لڑکی پڑی ہوئی انگوٹھا چوس رہی تھی اور ماں کی
نگاہیں بار بار اسکی طرف لوٹ رہی تھیں اور نثار ہو رہی تھیں آنسوؤں کا دریا ماں
باپ کی آنکھوں سے جاری تھا۔ دل بانسوں اچھل رہا تھا ۔ لڑکی کا خیال کلیجہ

مل رہا تھا۔ جبتک لڑکی نظر آتی کچھ صبر رہا لیکن جوں ہی وہ نظر سے غائب ہوئی بیوی بے اختیار چیخ مار کر شوہر سے لپٹ گئی۔ دونوں گلے ملکر خوب روئے اور جب ولگی سپہر اس اچھی طرح نکل چکی تو بچوں کو ساتھ لیکر آگے روانہ ہوئے۔ دوسرے روز ایک گاؤں میں پہنچے مرزا غیاث انہیں ایک جھونپڑی میں بٹھا کر کچھ سامان ضروری لینے کیلئے باہر گیا اور ماں اپنی بیٹی کی یاد میں خون کے آنسو بہانے لگی۔

کرشمۂ قدرت

کہتے ہیں کہ جب فرعون کو معلوم ہوا کہ اوس کی سلطنت میں ایک ایسا لڑکا پیدا ہونیوالا ہے جو اوسکی جھوٹی خدائی کو خاک میں ملا دیگا اور اوس کی فرعونیت کے دعاوئی باطلہ کو مٹا کر رکھدیگا تو اوس نے ہر طرف منادی کرادی کہ آج سے جو لڑکا کہیں پیدا ہو میرے حکم سے فوراً اوسکا گلا گھونٹ دیا جائے اگر ماں باپ ایسا نہ کرینگے تو وہ قتل کرڈالے جائینگے اُسی زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو اُن کی ماں نے جو فرعون کے محلوں میں ملازم تھیں فرعون کے خوف سے ایک صندوق میں بند کرکے انہیں دریائے نیل میں بہا دیا۔ کچھ لوگوں نے دیکھ لیا صندوق کو کنارہ سے لگایا۔ اسے اور فرعون کے سامنے کھولا۔ اوسنے دیکھا کہ حسین بچہ پڑا ہوا انگوٹھا چوس رہا ہے۔ اور مسکرا رہا ہے اوس کے مسکرانے سے دل پر خاص اثر پیدا ہوا اور حکم دیا کہ اچھا اسے محلوں میں رکھو اور کسی کو رضاعت کیلئے مقرر کردو۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رضاعت اونہیں کی ماں کے سپرد کی گئی۔ اور وہ آغوش مادر میں پرورش پانے لگے اور بالآخر ایک بڑے پیغمبر ہوئے اور

سُنئے جب یوسف علیہ السلام کو اونکے بھائیوں نے کنوئیں میں ڈالدیا اور سوچا کہ اب
یہ اس کنوئیں میں گھٹ گھٹ کر مرجائیں گے تو اللہ تعالےٰ نے ایک قافلہ کو اوس
کنوئیں پر پہنچایا اور ایک شخص نے آپکو دیکھا اسمیں سے نکالا مصر لے گیا، اور چونکہ وہ سوداگر
تھا اور انسانی تجارت اوسوقت جائز سمجھی جاتی تھی اور انسان فروشی معیوب نہ تھی
اسلئے مصر میں لاکر زلیخا کے ہاتھ آپکو فروخت کر ڈالا۔ اور آخرکار آپ مصر کے بادشاہ ہوئے
ان دونوں واقعات کی تطبیق ہم نورجہاںؒ کے واقعات سے کرنا چاہتے ہیں اور دکھانا
چاہتے ہیں کہ خدا کی قدرت کے کرشمے کسی وقت خاص اور کسی زمانہ مخصوص کے
کیلئے مختص نہیں ہوتے اوس کی عنایتیں، نوازشیں، مہربانیاں، اور رحم و کرم کی
ہوائیں ہر وقت اور ہر جگہہ چلتی رہتی ہیں اور اوس کی رحمت کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا
جب نورجہاں کو مجبور ماں باپ جنگل میں تنہا چھوڑ کر چلے گئے تو رحمت کے فرشتوں نے
اوسے فوراً گود میں اوٹھا لیا۔ کارخانۂ قدرت کی طرف سے ایک سانپ نورجہاں
کا محافظ مقرر ہوا۔ ابھی یہ سامان ہو ہی رہے تھے کہ ایک شخص کا وہاں گذر ہوا اور
اس نے دیکھا کہ ایک کالا سانپ غالباً اپنا من اُگل کر اوس کی محافظت کر رہا ہے
لیکن جب یہ اور قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایک سُرخ و سفید بچہ ہے جس کے اردگرد
سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ پہلے تو یہ ڈرا کہ میں اس بچہ کو اُٹھاؤں اور مبادا
یہ سانپ مجھ پر حملہ کر بیٹھے۔ لیکن پھر ہمت کر کے ذرا آگے بڑھا تو وہ سانپ خودبخود
نورجہاںؒ کو چھوڑ کر پیڑ پر چڑھ گیا۔ نووارد مسافر نے جلدی سے بچہ کو گود میں اوٹھا لیا اور
خوش خوش اپنے سردار کے پاس پہنچا جو ایک مشہور اور ذی عزت سوداگر تھا۔ اور جس
کا قافلہ ہندوستان جا رہا تھا۔ سوداگر بچہ کو دیکھکر بہت خوش ہوا حفاظت سے اوسے

اپنے پاس اونٹ پر بٹھالیا اور وہاں سے یہ قافلہ روانہ ہو کر سب ہاسی گاؤں میں پہنچا جہاں مرزا غیاث معہ اپنی بی بی بچوں کے مصیبت کی زندگی بسر کر رہا تھا اور اُس کی واماندگیوں نے اوسے دم لینے کے لئے ٹھہرا دیا تھا۔ یہاں پہنچکر سوداگر نے ایک شخص کو اِدھر اُدھر بھیجا کہ کسی دودھ پلانے والی کو تلاش کر کے لائے تا کہ بچی اُسکے سپرد کیجاوے۔ وہ شخص رضاعہ کی تلاش میں گھومتا پھرتا یہاں آیا جہاں مرزا غیاث کا مختصر مگر مصیبت زدہ خاتون حسرت و یاس کے عالم میں بولی [illegible] تمہاری عورت ایک بچہ کو دودھ پلا سکتی ہے؟ ایران کی شاہی خاندان والی [illegible] اپنے شوہر کا منہ دیکھنے لگی۔ اُسے اپنی امارت اور عزت دمیں چٹکیاں لیتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اپنی بچی کو یاد کر کے عصمت النسا بیگم چہا تی ہی نہیں آنکھیں بھی بھر آئیں اور وہ زار و قطار رونے لگی۔ مرزا غیاث نے اس مصیبت وا[illegible] اس وابستگی کو غنیمت جانا اوس شخص سے کہا کہ میری بی بی دودھ [illegible] ہے اوس نے کہا کہ تم دونوں ہمارے سردار کے پاس چلو وہ لڑکی تمہارے سپرد کر دینگے مرزا غیاث معہ اپنی بی بی کے سوداگر کے پاس آئے تو اوس نے ان کے چہرہ سے آثار شرافت نمایاں دیکھ کر فوراً بغیر مزید دریافت حال لڑکی کو عصمت النسا کے سپرد کیا۔ اور کہا کہ تم اسے دودھ پلاؤ ہم تمہیں اسکے عوض میں کچھ دیدیا کرینگے۔ عصمت النسا بیگم نے لڑکی کے گلے میں اپنی انگوٹھی دیکھی تو جوش مسرت سے اسکی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور چہرہ بشاش ہو گیا۔ مرزا غیاث نے اشارتاً پوچھا کیا ہے؟ تو عصمت النسا بیگم نے جواب دیا کہ یہ تو تمہاری ہی بچی ہے۔ مرزا غیاث بھی اس حسن اتفاق سے بیحد خوش ہوا اور اس واقعہ کو نورجہاں اور اپنی زندگی کے لئے

فال نیک سمجھا سوداگر نے یہ معلوم کرکے کہ یہ دو میاں بی بی ایک دم خوش ہو گئے
ان سے حال دریافت کیا۔ اونھوں نے اپنا پورا افسانہ ادت بلفظہ کہہ سنایا جب
سوداگر کو معلوم ہوا کہ مرزا غیاث خواجہ شریف کا لخت جگر ہے اور یہ اوس کی بی بی
عصمت النسا بیگم ہے تو اوسکے دل پر ایک عبرت آفرین اثر پڑا اور اس نے فوراً
عصمت النسا کیلئے پردہ کا انتظام کر دیا۔ مرزا غیاث کی بھی آبرو کی گئی اور انکے
بچوں کو بھی آرام دینے کی ہر مناسب کوشش عمل میں لائی گئی یہ پہلی برکت تھی جو
نورجہاں کی وجہ سے مرزا غیاث اور عصمت النسا کو حاصل ہوئی۔ اور یہ سب کے سب
بڑی عزت اور پورے آرام کیساتھ اسی قافلے کے ہمراہ ہندوستان پہنچے اور پھر اکبرآباد
(آگرہ) میں آکر سوداگر کے ساتھ مقیم ہوئے۔

مرزا غیاث کی قسمت کا پانسہ

سوداگر ملک مسعود کے گھر میں نورجہاں کا باپ ماں اور بھائی بہن سب چین سے
رہنے سہنے لگے اور نورجہاں ایک خاص خوبصورتی اور تناسب کے ساتھ نشو ونما پانے لگی ایک
دن ملک مسعود دربار شاہی میں بمقام فتحپور سیکری پہنچا۔ بار یاب ہوا اور قسم قسم کے تحفے تحایف
دکھانے لگے۔ کہنے لگا کہ میں شہنشاہ کے لئے ایک بولتا ہوا لعل بھی لایا ہوں جو حقیقت
میں اس قابل ہے کہ درج شاہی میں رہے۔ اسکے بعد مرزا غیاث نورجہاں اور اسکی
والدہ کا مفصل حال سنایا اور جو جو واقعات صحرائے قندھار میں ان پر گذرے تھے تمام
وکمال بیان کئے شہنشاہ اکبر نے حکم دیا کہ مرزا غیاث کو ہمارے حضور میں حاضر کرو
چنانچہ ایک دن موقعہ پاکر ملک مسعود نے بڑی خوشی سے آگرہ میں مرزا غیاث کو

حضور میں پیش کر دیا مرزا غیاث کے پاس سلطان ہمایوں کا نوشتہ تھا جسمیں لکھا تھا۔
کہ ہمارے قیام ہرات کے موقعہ پر مرزا غیاث کے دادا نے ہماری بڑی خدمت کی اور
ہم اوس سے بیحد خوش ہیں۔ یہ نوشتہ اکبر کو دکھایا گیا۔ وہ مرزا غیاث سے ملکر بہت
خوش ہوا۔ اور مرزا غیاث کو اسی دن سے دیوان بیوتات کر دیا۔ اب تو مرزا غیاث
چھتیس کارخانوں کے مالک بنگئے تمام تجارت شاہی سے تعلق ہوگیا۔ کارخانوں
میں ان کا حکم چلنے لگا اور سرکار دربار میں آزادی کے ساتھ رسائی ہوگئی نورجہاں
اور اسکی ماں شاہی محلوں میں رہنے لگے اور تمام آسائشیں اس مصیبت زدہ خاندان کو
میسر آگئیں اسکے تمام درد اور مایوسیاں نیز غربت و مسافرت کی تکلیفیں خوشی سے بدل
گئیں اور سب خدا کا شکر کرنے لگے ؎

اوسے فضل کرتے نہیں لگتی بار   نہ ہو اوس سے مایوس امیدوار

مہرالنساء

اب مرزا غیاث کو آگرہ میں رہتے رہتے پانچ برس ہوگئے اس عرصہ میں انکی وقعت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی انکی لڑکی بھی پانچ
برس کی ہوگئی اور اسکے حسن و جمال میں اضافہ خاص ہوتا گیا۔ پانچویں برس اسکا
پہلا نام "مہرالنساء" رکھا گیا اور اس تقریب میں خوشی کے جلسے مرزا غیاث کیطرف سے
کئے گئے۔ وہ شخص جس نے گذر بسر کے لئے اپنی بیوی کو دودھ پلانے کی ملازمت
کیلئے اجازت دیدی تھی آج ہزاروں روپیہ اپنے ہاتھ سے اوٹھا رہا ہے اور وہ
ماں جو فلاکت و غربت کے خیال سے "زہرۂ عالم" نورجہاں کو جنگل میں بار آغوش
سمجھ کر چھوڑ آئی تھی سینکڑوں کنیزوں میں ملکہ بنی بیٹھی ہے سبحان اللہ یہ سب قدرت

کے کرشمے ہیں اور انسان اپنے مستقبل سے بالکل آگاہ نہیں ہے کہ کل کیا ہوگا
کوئی حالت دنیا میں ایک سی نہیں رہتی اور ہر حال میں ایک انقلاب پیدا ہو جاتا ہے
یہ نیرنگی ابتدائے عالم سے جاری ہے اور انتہائے عالم تک یوں ہی جاری رہے گی۔

تعلیم و تربیت

شاہی محلوں کا رہنا سہنا، ناز میں پلنا، لاڈ میں پرورش پانا، نوجوان بہت جلد
ہوشیار ہو گئی۔ اور چونکہ عصمت النسا بیگم شاہی محل کی اتالیقہ تھیں اسلئے اپنی لڑکی کو
نوشت و خواند میں بھی پہلے انہیں نے حصہ لیا۔ مہر النسا نے قرآن شریف بہت
جلد ختم کر لیا۔ اور ایسی خوش الحانی سے پڑھنے لگی کہ تمام محل شاہی میں دھوم ہو گئی اس
کی پیاری اور رسیلی آواز حسین صورت حسن سلیقہ دیکھ کر تمام شہزادیاں اس پر
نثار جاتی تھیں۔ ورا سکی دیکھنے والیاں اسے آنکھوں پر بٹھاتی تھیں ۵ برس
تک مہر النسا نے زری کا کام سینے پرونے کا کام کشیدہ کاری وغیرہ وغیرہ ہنر زنانہ
تعلیم کے ساتھ حاصل کئے اسکے بعد ایک معتمر شخص مرزا ہادی اسکی تعلیم کے لئے مقرر
کئے گئے انہوں نے بہت جلد پوری محنت کے ساتھ گلستاں۔ بوستاں۔ انوار سہیلی۔
مینا بازار۔ یوسف زلیخا وغیرہ کتابیں پڑھا دیں عربی میں بھی کافی مہارت پیدا کر دی
الف لیلا اور کلیلہ و دمنہ کے افسانے اسے یاد ہو گئے۔ اور وہ فارسی عربی میں بڑی
قابلہ ہو گئی دس برس کی عمر میں مہر النسا نے اتنا کچھ سیکھ لیا کہ دوسری لڑکیاں
بیس برس میں بھی نہ سیکھ سکتیں۔ نیزہ بازی، تیر اندازی، شہسواری، تفنگ بازی
وغیرہ سپاہیانہ فنون اس نے اپنے باپ اور بھائیوں سے سیکھے تیرنا۔ ماہی خاتم

سے سیکھا اور زنانہ مذاق کے ہنر بھی عنبر دانیوں سے حاصل کر لئے دسویں برس وہ اپنی خوش سلیقگی، تہذیب، متانت، علم عقل حسن اور سیرت کے لحاظ سے ایک اچھی شہزادی، اچھی ملکہ، اور ایک سگھڑ بی بی بنگئی جس نے محل شاہی کے رہنے والوں اور رہنے والیوں کے دلمیں پورا رسوخ اور وقار حاصل کرلیا شہزادے مہرالنسا کے ساتھ بے تکلف اور آزادانہ رہتے سہتے تھے، پردہ کی محلوں میں سخت پابندی تھی لیکن مہرالنسا ابھی جوان نہ تھی جو اسپر پردہ کی قید لگائی جاتی شہزادوں کیساتھ کھیلتی تھی، کھاتی پیتی تھی، بیٹھتی اُٹھتی بھی تھی اوران کے ... میں شریک بھی ہوتی تھی۔ شہزادے اسکی سلیقہ مندی اور متانت کیوجہ سے اپنی صحبت کے قابل سمجھتے تھے۔ اور یہ ہمیشہ اونہیں کے ساتھ مشاغل علمی میں مصروف رہتی تھی اکثر شہزادہ سلیم سے جس کا لقب بعد میں جہانگیر ہوا، گفتگو ... تھی۔ اور یہ اُس کے سامنے بھی بے تکلف اور بے پردہ آتی جاتی تھی۔

شہزادہ سلیم اور مہرالنسا

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد بسا کیں لذت از گفتار خیزد

یہ سب کچھ تھا کہ محل سرائے شاہی میں لڑکیوں کی عصمت و عفت کا بیحد خیال و لحاظ رکھا جاتا تھا۔ مگر ایک محل میں ایک ہی قصر میں ہر وقت کا رہنا سہنا اُٹھنا بیٹھنا مہرالنسا شہزادوں سے چھپ کر کہاں جاتی۔ اورادوں کے ساتھ اکثر مصروف سیر چمن بھی رہتی تھی پڑھتی تھی کھیلتی بھی تھی غرضکہ کسی قسم کی بیگانگی نہ تھی۔ ہاں شہزادہ سلیم اکبر کا لاڈلا بیٹا، اور شہزادوں کا پلا ہوا نورِ نظر تھا۔ اسپنے آداب شہزادگی

اور وقار صاحبقرانی کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت کم توجہ کے ساتھ مہرالنسا کیطرف
دیکھتا تھا نہ مہرالنساء کے دلمیں کسی قسم کا خیال تھا جو شہزادے کو اپنی طرف توجہ کرے وہ
بھی شاہی آداب کا لحاظ رکھتی تھی اور متانت و سنجیدگی کیساتھ پیش آتی تھی شہزادہ سلیم
مہرالنساء کی تربیت و تعلیم تناسب جسم خوبصورتی اور لیاقت کی شہرت سے متاثر
ضرور تھا مگر جسطرح چاند کے سامنے تاروں کی کتنی ہی تعریف ہو وہ اُس سے متاثر نہیں
ہو سکتا اسیطرح شہزادہ سلیم سب کچھ اُسکے متعلق سنتا تھا مگر اپنی قابلیت کے سامنے
اور مہرالنساء کی [illegible] کا آفتاب دھندلا نظر آتا تھا۔ اور وہ اسکی طرف اُچٹتی ہوئی
نگاہ ڈالکر اُسے بھلا دیتا تھا حُسن اتفاق سے ایک روز شہزادہ سلیم چمن شاہی میں کبوتر
اڑا رہا تھا اور مہرالنساء اپنی چند سہیلیوں کیساتھ اوس کے قریب مصروف گلگشت
تھی شہزادے نے دو کبوتر مہرالنساء کو دیے اور کہا کہ انہیں اچھی طرح پکڑے رہو
مہرالنساء نے حکم کی تعمیل کی اور شہزادہ اپنے کھیل میں مصروف ہو گیا تھوڑی دیر ہوئی تھی
کہ اتفاق سے ایک کبوتر مہرالنساء کے ہاتھ سے نکل گیا اور اوڑکر شاہی باغ میں خدا
جانے کس طرف غائب ہو گیا شہزادہ جب اُسکی طرف رجوع ہوا اور کہا کہ میرے کبوتر
لاؤ مہرالنساء نے کہا کہ صاحب عالم ایک کبوتر تو اُڑ گیا۔ ایک باقی ہے لیجئے شہزادہ نے
دریافت کیا کہ ہائے ایک کبوتر کیسے اُڑ گیا مہرالنساء نے دوسرا کبوتر بھی ہاتھ سے چھوڑ دیا اور کہنے
لگی کہ حضور ایسے" نہ معلوم ان دو لفظوں میں یا ایک فقرے میں کس بلا کا جادو اثر تھا کہ شہزادہ
سلیم بجائے خفا ہونیکے مسکرا کر رہ گیا اور اسی وقت سے مہرالنساء کی محبت نے شہزادہ سلیم کے دلمیں جگہ پیدا کر لی
اس واقعہ کو شیخ عاقل نے اپنی مثنوی میں اسطرح لکھا ہے ؂

کبوتر داد اورا شاہزادہ　　　بہ پروانہ کبوتر دل نہادہ

هژده چوں چنگل شہباز دیده | نگہ چوں پنجۂ شاہیں رسیده
دگر چوں دیده دست آں ممتاز | کبوتر کرده بود از دست پرواز
بپرسیدش چہ کردی آں کبوتر | بگفتہ رفت از دستم سراسر
دگر پرسید چوں رفتہ بگو باز | بگفتہ ایں چنیں کردست پرواز
چنیں گفت و کبوتر داد پرواز | ادایش لطف پیدا کرد با باز
کبوتر آں کہ در دست دگر بود | باد ہم پیش او بگذاشتہ زود
چو آں بش در ادائے دلبری دید | تبسم کرد و طرحش را پسندید
دل شہزاده را حسن و ادایش | بہم آموخت عشق فتنہ زایش

چونکہ شیخ عاقل کو کتب خانہ جہانگیری سے تعلق خصوصی تہا اسلئے اونکا یہ بیان کسی طرح غلط نہیں ہو سکتا اور واقعات مندرجہ تمام و کمال صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ غرضکہ اس طرح مہرالنسا بیگم نے جہانگیر یا شہزادہ سلیم کو اپنی خوش ادائی کی وجہ سے متوجہ کر لیا اور یہی بنیاد محبت ہوئی

مہرالنسا چودہویں برس میں

اسی طرح ہنستے کھیلتے مہرالنسا کی عمر چودہ سال کی ہو گئی اور مرزا غیاث اور اوسکی بیوی نے محلات شاہی میں کافی رسوخ و اعتبار پیدا کر لیا وہ لڑکی جسکا بچپن دوسری عورتوں کے شباب سے بہتر تہا شباب میں جو کچھ بھی ہو جائے کم ہے۔ ایک تو حسن لیاقت اوسپر تقاضائے عمر اب تو مہرالنسا اہل قلعہ کی نگاہوں میں پری بنکر پھرنے لگی جو اوسکی طرف دیکھتا تہا اوسکی نگاہیں مشکل واپس آتی تہیں حسن تقریر دلکشی تحریر متانت علم وقار حسن جمال حیرت سے بڑھکر تہی کو مہرالنسا کو چہوٹی کی دلہن بنا دیا تہا۔ ان

باپ اپنی مہ جمال لڑکی کو دیکھتے تھے اور اسکے آغاز حیات پر نظر کرتے تھے تو عجب طلسم
سا نظر آتا تھا وہ اپنے دلوں میں خیال کرتے تھے کہ یہ لڑکی آج محل شاہی میں دیکھنے کی
چیز بنی ہوئی ہے۔ ایک دن قندھار کے سنسان اور ہولناک جنگل میں بے مادر و پدر
تنہا پڑی ہوئی تھی کسے امید تھی کہ اسکا مستقبل اسقدر روشن ہوگا اور اس کی برکت
سے ہمارے دن پھر جائینگے۔ مہرالنساء کا یہ حال تھا کہ وہ تاریخ ایران، الف لیلہ،
عجائب المخلوقات، کلیلہ دمنہ، گلستان، بوستان، شاہنامہ، دیوان حافظ، انوار سہیلی
مینا بازار، یوسف زلیخا، سکندر نامہ، وغیرہ تمام فارسی کی سخت سے سخت کتابوں پر کافی
عبور حاصل کر چکی تھی۔ فن سپہ گری میں اوسکو پوری مہارت تھی۔ علم حدیث، فقہ،
حکمت کو دھو کر پی چکی تھی۔ اور مختلف فنون شریفہ و لطیفہ پر حاوی تھی۔ ہر موقع و محل
کے ہزاروں فارسی اشعار اوسے ازبر تھے اور وہ اپنے فضل و کمال کی وجہ سے ہر طرح
ملکہ بننے کے قابل ہو چکی تھی۔ سینے پرونے میں اس نے کافی دستگاہ حاصل کر لی تھی اور
اب حسن کا یہ عالم تھا کہ عصمت بانو اوسکی ماں اوسکے پردہ کا بہت زیادہ اہتمام رکھتی تھی
اور اسے کسی وقت اپنی آنکھوں سے اوجھل نہونے دیتی تھی وہ تیر نا خوب جانتی تھی۔
شکار گاہوں میں اوسنے معمولی طور اور غیر معمولی طور پر مشق بڑھائی تھی۔ وضع اور طرز
میں جدت نگاری اسکی ذہانت کا ایک ادنی کرشمہ تھی اسنے گھوڑوں پر چڑھنے کی سواری
بھی سیکھ لی تھی اور ہر قسم کے ہتھیاروں کی شناخت میں بھی اسے ید طولی حاصل تھا۔
اسکی وجہ یہ تھی کہ مرزا غیاث تمام شاہی کارخانوں کے مختار تھے۔ اس لئے ہر چیز
اوسکے سامنے آتی تھی اور وہ ہر چیز کی ماہیت کے دریافت کرنے میں اپنا ذہن صرف
کرتی رہتی تھی۔ اوسنے اپنی ایک خاص لائبریری قائم کر لی تھی جسمیں وہ اکثر دن اور

رات میں زیادہ وقت صرف کرتی تھی اور کتابوں کے دیکھنے بھالنے سے اور کثرت مطالعہ
سے اوسے ہزاروں نئی علمی باتیں معلوم ہوگئی تھیں۔ اوسنے اسی صغر سنی میں شعر
گوئی اور شعر فہمی میں بھی کافی قوت حاصل کرلی تھی اور کبھی کبھی خود ہی شعر بناتی اور
اُسے خود ہی گنگناکر اسکا مزہ لیتی رہتی تھی غرض یہ ہے کہ چودہویں برس میں مہرالنسار
علم و فضیلت اور حسن و لیاقت کا ایک پورا چاند تھی جس پر اہل نظارہ کی نگاہیں
محبت آمیز وقار و ادب کیساتھ پڑتی تھی اور شہزادہ سلیم کی توجہ میں روز نئے جذبات
نئے اضطراب اور نئی بیقراری کا اضافہ ہوتا جاتا تھا۔

پہلی شادی

شہزادہ سلیم کی محبت اور دلبستگی کا راز پوشیدہ نہ رہا۔ اور اوسکی متاہل نگاہوں سے
شہنشاہ اکبر سے سب کچھ کہدیا۔ اکبر ایک زمانہ شناس، معاملہ فہم اور مآل اندیش بادشاہ
تھا جب اُسنے شہزادہ سلیم کی للچائی ہوئی نگاہوں کو دیکھا اور کبوتروں کا واقعہ سنا
تو اوسکا ماتھا ٹھنکنے لگا اور وہ سوچنے لگا کہ کہیں شہزادی کی محبت اور توجہ کوئی نیا
رنگ نہ لائے۔ وہ جانتا تھا کہ ہرچند مرزا غیاث میرا ملازم ہے اور میرے اختیار
میں ہے۔ تاہم اوسکا تعلق ایران کی وزارت سے رہ چکا ہے اور اُسکی بی بی عصمت
بانو ایران کے خاندان سے علم و اجتہاد سے وابستہ رہ چکی ہے اسلئے کہیں ایسا
نہ ہو کہ شہزادے کی دلبستگی مہرالنسار کو خلعت زوجیت سے سرفراز کرکے کسی
پولٹیکل خواہش کو اوبھار دے اور شادی ہوجانے کے بعد مرزا غیاث کا ایرانی
خاندان سلطنت مغلیہ پر قابض و مالک ہوجانیکا دعوی کر بیٹھے ان خیالات

متاثر ہوکر اوسنے شہزادہ سلیم کو ایک دن تنہائی میں بلایا اور کہنے لگا کہ بادشاہوں کے محلوں میں جو شریف لڑکیاں رہتی ہیں ان کی نسبت شہزادوں کا خیال قابل اعتبار ہونا چاہیے۔ شہزادوں کو ہرگز لازم نہیں ہے کہ وہ محل میں رہنے والی لڑکیوں کو محبت اور خواہش کی نگاہ سے دیکھیں۔ ادہر تو اکبر نے پردہ ہی پردہ میں شہزادہ سلیم کے خیالات پر اُمید و بیم کا رنگ پھیرا اُدہر مرزا غیاث سے کہا کہ تمہاری لڑکی ہوشیار ہوگئی اس کی شادی کی کچھ فکر ہونا چاہیئے۔ مرزا غیاث اور اُن کی بی بی نے دست بستہ عرض کی کہ حضور مالک ہیں حضور سکے ہوتے ہم کون ہیں کہ مہرالنساء کی شادی کے متعلق کوئی رائے قائم کریں ہم ہی آپکے ہیں وہ بھی آپکی ہے جیسا حضور کے خیال میں مناسب ہو کیا جائے ہمیں چون وچرا کا اختیار نہیں ہے۔ حضور مختار ہیں جو چاہیں کریں شہنشاہ اکبر اچھی طرح سمجھتا تھا کہ مہرالنساء کوئی لڑکی نہیں ہے جسکا ہاتھ بغیر سوچے سمجھے کسی کے ہاتھ میں دیدیا جاتے۔ اس لئے اوسکی نگاہیں ارکین سلطنت کے ہر فرد پر پڑتی تھیں اور واپس آجاتی تھیں۔ آخر اوسکی نگاہ انتخاب علی قلی خان ترک پر پڑی اور اسکے وجود میں ایسے مہرالنساء کے قابل جوہر نظر آنے لگے۔ علی قلی ترکی نسل کا ایک جوانمرد جنگجو سپاہی تھا وہ شہنشاہ اکبر کی ملازمت سے پہلے ایران میں شاہ طہماسپ صفوی کا سفرہ چین رہ چکا تھا۔ اور اب خان خاناں کے ذریعہ سے دربار اکبر میں ممتاز و سرفراز تھا اور اپنی بہادری و جوانمردی کا بار بار امتحان دے چکا تھا۔ دربار والے اسکی شجاعت و بسالت [illegible] کرتے تھے اور اکثر مہمات عظیم کے لئے اسی کو منتخب کر دیا کرتے تھے چنانچہ علی قلی ایک مرتبہ کسی مست ہاتھی کے مقابلہ میں کھڑا کر دیا گیا۔ حاسدوں نے تو اسکی زندگی کو ختم کرنیکا منصوبہ اور سامان کیا تھا مگر خدا کو اسے جوانمرد ثابت کرنا

مقصود تہا۔ علی قلی نے ایک ہی ضربے میں اُس فیل مست کا کام تمام کر دیا اور دشمنوں کے سامنے سرخرو ہوا۔ دوسری مرتبہ شیر سے مقابلہ کرا دیا اب بھی اوسنے شیر کو للکار کے تلوار سے مار ڈالا۔ اور اس بہادری کے صلہ میں شہنشاہ اکبر نے اُسے "شیر افگن" کا بہادرانہ اور قابل رشک خطاب دیکر اوس کے حاسدوں میں اوسکا مرتبہ اور بھی دو بالا کر دیا۔ ان اوصاف سے متصف دیکھ کر اور اوس کی قابلیت و جوانمردی پر اعتبار کر کے اکبر نے مہرالنساء کا نکاح شیر افگن خاں سے پڑھوا دیا اور یہ نونہال گلزار کمال شیر افگن کی آغوش میں دیدی گئی اب تک تو شیر افگن کے چند ہی حاسد تھے مگر اب اس تعلق نے اُسے شہزادہ سلیم کا حریف و رقیب بھی بنا دیا سلطنت کی ملازمت پھر حریفوں کے مقابلہ بڑا سخت تھا۔ شیر افگن مست ہاتھیوں کو گرا سکتا تہا۔ بہوکے شیروں کو مار سکتا تہا لیکن حریفوں اور حاسدوں سے مقابلہ کرنا اوسکے امکان سے باہر تہا مہرالنساء کی محبت نے اوسکا دل کمزور کر دیا تہا اور وہ سمجھتا تہا کہ میں سب سے عہدہ برآ ہو سکتا ہوں لیکن شہزادہ سلیم کی طفلانہ ہٹیلی طبیعت کے جوش سے مقابلہ کرنا آسان نہیں ہے۔ یہ سوچ کر وہ اپنی جاگیر بردوان میں بہ اجازت شاہی مقیم ہوا اور وہاں مہرالنساء کے گلزار حسن سے بلا خوف صیاد بہ اطمینان گل چینی کرنے لگا۔ مہرالنسا کی ماں بھی اوسکے ساتھ تہی۔ اور یہ سب کے سب سکون و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔

خاکستر عشق کا اشتعال

جب شہنشاہ اکبر کا پیمانۂ حیات لبریز ہوا۔ اور اس نے داعی اجل کو لبیک کہا تو
۱۶۰۵ء میں عنان سلطنت شہزادہ سلیم نے اپنے ہاتھ میں لی اور اپنا لقب جہانگیر
رکھا اب سے ہم بھی شہزادہ سلیم کو جہانگیر ہی کے نام سے مخاطب کریں گے۔
تخت پر بیٹھتے ہی جب انصرام امور سلطنت سے فراغت حاصل ہوئی۔ اور تمام
سلطنت اچھی طرح قابو میں آگئی تو جہانگیر کے دل میں عشق مہرالنساء کی جو
چنگاریاں دبی ہوئی تھیں ایک دم سے بھڑک اٹھیں ان کا سوز اس کے دل میں
چمک پیدا کرنے لگا۔ اور یہ مہرالنساء کو حاصل کرنے کی تدبیروں میں مصروف ہوا
ایام جوانی پھر شہنشاہی و صاحبقرانی، حکومت بھی موجود طاقت بھی میسر اور
سب پر مستزاد عشق نہفتہ۔ بھلا اب کون تھا جو اس کے بڑھتے ہوئے جوش
کو روکتا اور رکی ہوئی طبیعت کو ابھرنے سے باز رکھتا اس کا جوش محبت یکدم
بڑھا۔ اور سیلاب انتقام کی صورت اختیار کرنے لگا وہ شیر افگن کی بہادری
اور جنگجوئی سے واقف نہ تھا۔ اسلئے سوچنے لگا کہ کوئی ایسی تدبیر ڈھونڈنی چاہئے
کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ سوچتے سوچتے اس نے ایک تدبیر
سوچی اپنے رضاعی بھائی قطب الدین کوکلتاش بلاکر اپنے جذبات دلی کا اظہار
کیا۔ اور اسے اپنا ہمراز بنا کر بنگالہ کا صوبہ دار مقرر کیا۔ اسے تاکید اکید کی گئی کہ بنگال
میں پہنچتے ہی شیر افگن سے مہرالنساء کو طلاق دلوانے کی کوشش کرے اور اگر وہ
طلاق نہ دے تو اسے قتل کر کے مہرالنساء کو دارالسلطنت میں بحفاظت پہنچا دے

ادہر تو قطب الدین کوکلتاش بنگالہ کی صوبہ داری پر مامور ہوکر آگرہ سے چلا اُدہر
شیر افگن خاں کے وکیل نے جو دربار جہانگیری میں ہر وقت حاضر رہتا تھا اس واقعہ
کی خبر شیر افگن کو پہنچائی شیر افگن خاں فوراً تاڑ گیا کہ اس جدید تقرر سے جہانگیر
کا مطلب کیا ہے اور اس کی تہ میں وہ کسقدر گہرا کام کرنا چاہتا ہے ۔ چنانچہ ان
خیالات سے متاثر ہوکر اوسنے فوراً اپنی ملازمت کو استعفا دیدیا اور اس سے پہلے
کہ قطب الدین بنگالہ میں اپنی صوبہ داری کا جھنڈا گاڑے اُسنے سپاہیانہ لباس اور
اسلحہ وغیرہ سب اپنے جسم سے دور کرکے اپنی آزادی کا اعلان کردیا شیر افگن
جہانگیر کے جوش رقابت کا مقابلہ مردانہ وار کرنا چاہتا تہا اوسکے پہلو میں ایک غیور
دل تہا ۔ وہ مہرالنسا کی محبت پر شاہی ملازمت کو ترجیح دینا پسند نہ کرتا تہا ۔ اور وہ
سمجھتا تہا کہ میں سنہری چڑیا کو گلزار جہانگیری سے اڑا کر لایا ہوں اُسکے دوبارہ
پہانسنے اور صید کرنے کے لئے جہنجہلاہیاں ضرور توڑی جائینگی اسلئے اوسنے
یہی بہتر سمجھا کہ تعلقات خاندانہ سے کنارہ کش ہوکر اپنی محبت کی حمایت مردانہ
کرے اور حتی الامکان جہانگیر کی رقابت کو بارآور ہونے دے قطب الدین نے
بنگالہ پہنچتے ہی شیر افگن کے نام حاضری کا حکمنامہ بہیجا مگر اب شیر افگن شاہی ملازم
نہ تہا کہ قطب الدین کا حکم پاتے ہی سر تسلیم خم کرکے روانہ ہوجاتا اوسنے اوسکے
متواتر احکام کی بہی کچھ پرواہ نہ کی اور آسودگی و یکسوئی کے ساتھ اپنی جاگیر
بردوان میں خاموش بیٹھا رہا قطب الدین جس کام کے لئے مامور ہوا تہا ابہی وہ
کام باقی تہا اسلئے اُسنے خود بردوان کی راہ لی اور بحیثیت ایک صوبہ دار کے نہیں
بلکہ ایک دوست کے شیر افگن کو پیام ملاقات بہیجا شیر افگن اسکی اوس تجویز ملتا

مگر اوسکی شجاعت و بسالت نے قطب الدین سے نہ ملے پست ہمتی سے تعبیر
کیا اور گھر میں عورتوں کی طرح چھپ کر بیٹھ جانا اُسے پسند نہ آیا ۔ وہ اُٹھا ایک
بکترا اور اسکے اوپر لمبی آستینوں کا پوستین پہنا ۔ ایک زہر میں بجھی ہوئی تلوار
آستین میں چھپائی اور چند ہمراہیوں کی معیت میں شیروں کیطرح رقیب جہانگیر
کے سپاہی سے ملنے کے لئے بیباکانہ چلا ۔ جب شیر افگن قطب الدین کے خیمہ
میں پہنچا تو اوسکا بڑے تپاک اور گرمجوشی کیساتھ قطب الدین نے استقبال
کیا ۔ بٹھایا مزاج پوچھا اور کہنے لگا کہ شیر افگن یہ تم جانتے ہو کہ شہنشاہ
جہانگیر کو مہر النسا سے بچپن کی محبت ہے وہ اسکے ساتھ کھیلے ہیں اور آنکھ
تیر عشق سے اون کا دل ہدف ہو چکا ہے اسلئے اب مناسب یہی ہے
کہ تم اوسے طلاق دیدو اور شہنشاہ جہانگیر سے خلعت و ریاست حاصل
کرو ۔ وہ تمہیں اتنا کچھ عنایت فرمائیں گے کہ تم مہر النسا جیسی دس عورتیں
اپنے نکاح میں لاسکتے ہو ۔ شیر افگن نے تیور [illegible] کہ
قطب الدین کی یہ گفتگو اوسکے [illegible] ہی ہے مگر
وہ کمزور نہ تھا جو فوراً بھڑک اٹھتا [illegible] سے قطب الدین کی ہرزہ [illegible]
کا جواب [illegible] میں صاف کہا کہ جہاں پناہ کسی کی بیاہی
عورت [illegible] سے مجاز نہیں ہیں یہاں تو یہ باتیں ہو رہی تھیں ادھر
[illegible] شیر افگن کے ہمراہی گرفتار کئے جانے لگے اونکی آوازیں [illegible] شیر افگن
[illegible] بپھرا اور قطب الدین سے کھڑا ہو کر کہنے لگا کہ میرے آدمی کس جرم
میں گرفتار کئے جا رہے ہیں یہ کیا نامردانہ واقعات ہیں کیا تجھے دھوکا دیا

جارہا ہے۔ قطب الدین اسی اثنا میں چاہتا تھا کہ شیر افگن کی بدحواسی کا جواب خنجر سے دے کہ شیر افگن نے پھرتی کیسا تھ آستین سے تلوار نکالی اور اس زور سے قطب الدین کی پیٹھ میں ماری کہ اوسکی آنتیں نکل پڑیں اور وہ سرد ہوکر ذراسی دیر میں وہیں ڈھیر ہوگیا۔ قطب الدین نے جن لوگوں کو شیر افگن کے قتل کرنے کے لئے پہلے ہی سے چھپا رکھا تھا۔ وہ چاروں طرف سے دوڑ پڑے ایک آدمی اتنے مسلح سپاہیوں پر کیونکر غالب آتا۔ آخر ایک کشمیری کے ہاتھ سے شیر افگن زخمی ہوکر گرپڑا اور پھر جانبر نہ ہوسکا تزک جہانگیری میں اس واقعہ کو جہانگیر نے اپنے قلم سے اسطرح تحریر کیا ہے "علی قلی استاجلو کہ سفرچی شاہ اسمعیل والی ایران بود بعد از فوت بنا بر شرارت و فتنہ انگیزی کہ در طبیعت داشت بگریختہ بقندھار آمد و در ملتان ملازم خان خانان شد خانخانان او را داخل بندہا سے سرکار آشنائی ساخت۔ در وقتے در خدمت والد بزرگوارم بودو در ایامیکہ خود بدولت متوجہ ولایت دکن شدند و مرا بسر رانا تعین فرمودہ آمدہ نوکر من شد او را بخطاب شیر افگنی سرفراز ساختم۔ چون از الہ آباد بخدمت والد بزرگوارم آمدم بنا بر نا اتفاقی کہ نسبت من بظہور رسید اکثر ملازم و مردم من متفرق شدند۔ او ہم دریں وقت از خدمت جدائی اختیار نمود بعد از جلوس از روئے مروت تقصیرات او در نظر نیاوردہ در صوبہ بنگالہ حاکم جاگیر کردم از انجا اخبار رسید کہ امثال من فتنہ جویان را دریں ولایت گذاشتن از عقل نیست بقطب الدین خان حکم رفت کہ او را بدرگاہ فرستد و اگر خیال فاسد داشتہ باشد بسزا رساند۔ خان مشار الیہ او را بواجبی مے شناخت با مردم

که حاضر بودند بمجرد رسیدن حکم بردوان که جاگیر او بود یلغار نموده. علی قلی
خان چون از رسیدن قطب الدین خان خبردار شد تنها با دو جلودار باستقبال
او متوجه گردید بعد از رسیدن دو آدمیان فتح خان مشارالیه مردم او را
فرو میگیرند او چون فی الجمله ازین روش قطب الدین خان به مظنه شده بود
از وے فریب میگوید که این چه روش تو پیش گشت. خان ناکرده مردمان را منع
کرده تنها با او همراه مے شود که مضمون حکم را خاطر نشان سازد. دریں وقت فرصت
جسته فی الفور شمشیر کشیده دو سه زخم کاری بادمیر ساند چون انبه خان کشمیری
ز حاکم زاده ہائے کشمیر بود بخان مشارالیه نسبت و محبت تمام داشت از روی
حلال نمکی و مردانگی خود را رسانیده زخم کاری بر سر علی قلی زد و این منفی شمشیر
بانبه خان زده زخمش کاری افتاد چون قطب الدین خان را باین حالت
دیدند مردم ہجوم آورده او را پاره پاره ساختند و بجہنم فرستادند. امید که
ہمیشه در جہنم جائے آن بدبخت در دسیاه بوده شد. انبه خان ہاں جا
شہادت یافت. و قطب الدین خان کو بعد از چار پہر در منزل خود برحمت
ایزدی پیوست۔

اپنے تحریری بیان میں جہانگیر نے مہرالنسا کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے۔ بلکہ
شیر افگن کے قتل کو پولیٹیکل وجہ سے وابستہ کیا ہے لیکن عام مورخوں
کا اتفاق ہے کہ جہانگیر نے شیر افگن خان کو صرف جوش رقابت سے
مجبور ہو کر قتل کرایا۔ اور اپنے دلی بغض اور غیظ کا انتقام اس طرح لیا

مہرالنساء جہانگیر کے اختیار میں

"پرائے بس میں پڑکر قہر سے مجبور ہو جانا"

قطب الدین کوکلتاش اور شیر افگن کا قتل کوئی معمولی قتل نہ تھا۔ سارے بنگالہ میں ہل چل مچ گئی۔ بردوان میں قیامت سی بپا ہوگئی عصمت بانو والدہ مہرالنساء کو جب شیر افگن کے قتل کی خبر پہنچی۔ تو وہ سمجھ گئی کہ اوسکی اور اسکی لڑکی مہرالنساء کی قسمت اب ایک اور پلٹا لینے والی ہے مہرالنساء اپنی چھوٹی سی لڑکی کو چھاتی سے لگائے ہوئے (جو شیر افگن کے صلب سے تھی) ایک کونہ میں بیٹھی ہوئی رو رہی تھی اوسے فی الحقیقت شیر افگن سے محبت تھی اور وہ اُسے دل سے چاہتی تھی۔ اسلئے بے اختیاری کی حالت میں آنسوؤں سے چشمہ زار بنا ہوا تھا اور آنکھیں روتے روتے سرخ ہوگئی تھیں یہ حال دیکھکر عصمت بانو بیگم نے اُسے سمجھایا کہ لڑکی دیوانی ہوئی ہے۔ ابھی زندگی میں خدا جانے کتنے انقلاب دیکھنے ہیں۔ یہ تو تیری زندگی کا پہلا سانحہ ہے۔ عقلمند اور تعلیم یافتہ ہوکر اسقدر دل چھوٹا کرنا اور انجام کار پر نظر نہ ڈالنا تیری ذات سے متوقع نہیں ہے۔ صبر کر اور دیکھ کہ وہ خدا جس نے تیری لڑکی وقت سنسان میدان میں مدد کی تھی اس ابتک وہی ہے کہ عالم پیدا کیا ہے۔ ادھر بردوان کے چند بااثر لوگوں نے اپنی سرخروئی کے لئے سوچا کہ قبل از احکام کے پہلے مہرالنساء اور اوسکی والدہ کو جلد از جلد آگرہ پہنچا دیا جاوے تو ہم انعام خسروانہ کا باعث ہونگے۔ یہ سوچ کر چند لوگ

عصمت بانو بیگم کے پاس آ گئے وہ اپنے دل میں پہلے ہی سے تہیہ کئے بیٹھی تھی۔ فوراً اپنی بیٹی اور نواسی کو لیکر آگرہ کی طرف اون لوگوں کیساتھ روانہ ہو گئی ادہر یہ سوگوار قافلہ آگرہ پہنچا ادہر شہنشاہ جہانگیر کا حکم حاکم بردوان کو پہنچا کہ مہر النسا اور اوسکی ماں کو فوراً آگرہ کی طرف روانہ کردو۔ اس کے جواب میں اوسنے لکھ بھیجا کہ وہ قبل صدور حکم آگرہ کی طرف بعزت و احترام روانہ کردی گئیں جب مہر النساء اپنی ماں کے ساتھ آگرہ پہنچی اور شاہی محلوں میں آئی تو دوسرے دن جہانگیر نے اوسکا عندیہ لیا اور ایک خادمہ کے ذریعہ سے دریافت کروایا کہ اب اوسکا اپنی آیندہ زندگی کے متعلق کیا خیال ہے — مہر النسا نے صاف کہلا بھیجا کہ میں تو آیندہ زندگی بیوگی میں اپنی عمر کاٹنا چاہتی ہوں اور ایسا ہی کروں گی بھی۔ مہر النساء کا یہ جواب صاف جب جہانگیر نے سُنا تو وہ کچھ زیادہ پریشان نہیں ہوا اور سمجھا کہ شیر افگن کی موت کا زخم ابھی اوسکے دل پر تازہ ہے۔ رفتہ رفتہ جب اندمال پذیر ہوگا تو پھر دیکھا جائیگا یہ سوچ کر اوس نے سلطانہ سلیمہ بیگم زوجہ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کو بلا کر مہر النسا کو ان کے حوالے کر دیا کہ وہ اپنے مرحوم بیٹے قطب الدین کوکلتاش کا اس کو معاوضہ سمجھے۔ سلطانہ سلیمہ بیگم کچھ ناداں تو تھیں نہ جو جہانگیر کے اس رمز کو نہ پہچانتیں وہ سمجھ گئیں کہ مہر النساء کی حوالگی سے شہنشاہ کا کیا مطلب ہے اور دو برس کی متواتر صحبت اور یکجائی نے مہر النسا کی طبیعت کو بہت کچھ جہانگیر کیطرف مائل کر دیا۔ جیسا کہ ان روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ مہر النساء نے ایک گلدستہ نرگس کا تیار کر کے

بادشاہ کے دربار میں بھیجا اور اسی کے ساتھ یہ مصرعہ بھی لکھ کر نذر کیا ع

نیست نرگس چشم قدرت گرد شوق روئے تو

اسکے جواب میں جہانگیر نے یہ مصرع لکھا۔

مصرع

کاش باشد نور ہم در نرگس دلجوئے تو

چونکہ شہنشاہ جہانگیر کا نام "نورالدین" تھا اسلئے اس مصرع میں لفظ نور ہم
جو معنی پیدا کرتا ہے وہ محتاج تشریح نہیں۔ اس مصرع کے جواب میں مہرالنسا
نے یہ شعر لکھ کر بھیجدیا۔ **شعر**

نور را در چشم از روز ازل جا دادہ اند

ہم اندر پردہ تا پنہاں جمال روئے تو

مہرالنسا کی شادی جہانگیر سے

جب اس حالت میں مہرالنساء کو سلطانہ سلیمہ بیگم کی نظربندی میں رہتے رہتے
ال سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ تو مہرالنساء کو سلطانہ موصوف نے بہت کچھ
ادھر از سمجھا بجھا کر نکاح ثانی کی طرف راغب کیا اور اسکی سہیلیاں
ول، حیات النساء بیگم وغیرہ مہرالنساء کو ہر وقت ترغیب دیتی رہتی ہیں۔
ہر شہنشاہ جہانگیر نے مہرالنساء کے باپ اور بھائیوں کے مناصب بڑھانے کیطرف
توجہ کردی۔ غرضکہ یا حسن الوجوہ جہانگیر کی محبت اور توجہ نے مہرالنساء کے دل کو
موم کر ہی لیا۔ ایک دن موقعہ پاکر سلطانہ سلیمہ بیگم نے مہرالنساء کو شہنشاہ

جہانگیر کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا۔ آنکھوں کا چار ہونا تھا کہ ایک تیر عشق ادھر تو کلیجہ کے پار ہو گیا۔ ادھر مہر النساء کی نگاہیں بھی جھک گئیں۔ سلطانہ نے اسکی عصمت وعفت، بردباری، تحمل، اور ضبط شباب کی کیفیت حضور بادشاہ میں عرض کی پہلا اب جہانگیر کو تاب ضبط کہاں تھی، چنانچہ اپنے سال جلوس کے چھٹے سال یعنی ۱۶۱۱ء میں جہانگیر نے بڑے تزک و احتشام اور شاہانہ جلوس کے ساتھ مہر النساء سے شادی کر لی اور مہر النساء کو "نور محل" اور "نور جہاں" کے روشن خطابات حضور شاہ سے عطا ہوئے۔ نور جہاں کی ایک مہر علیحدہ تھی جسمیں کندہ تھا سہ

نور جہاں گشت بفضل الٰہ ہمدم و ہمراز جہانگیر شاہ

نور جہاں کی شاہانہ زندگی پر ایک نظر

جب نور جہاں بادشاہ بیگم ہوئی اور اُسے نور الدین جہانگیر بادشاہ ہندوستان کی ملکہ بننے کا فخر حاصل ہوا تو اس نے اپنی پوری لیاقت و دانائی کے ساتھ بادشاہ کی نگاہوں میں اپنا اعتبار اور اسکے دل میں اپنا وقار قایم کر لیا۔ وہ عدالت کے وقت پردہ میں اپنے شوہر کے ہمراہ بیٹھتی اور مقدمات سنتی اور اُن کا فیصلہ اُن کی رائے سے ہوتا۔ ہر مہم سے مہم اور نازک سے نازک معاملہ کو اس خوبی اور انصاف کے ساتھ سلجھاتی کہ بڑے بڑے مدبران سلطنت دانتوں میں انگلیاں داب کر رہجاتے فرامین شاہی کی پیشانیوں پر یہ عبارت ہی لکھی جانے لگی

بحکم علیہ عالیہ مہد علیا نور جہاں بادشاہ

سکہ رائج الوقت میں بھی اوسکا نام شہنشاہ جہانگیر کے ساتھ مسلوک ہونے لگا اور یہ عبارت کندہ ہونے لگی۔

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور　　بنام نورجہاں بادشاہ بیگم زر

وہ نہ صرف معدلت گستری اور عدل آرائی میں بادشاہ کا ساتھ دیتی تھی اور اسکی مشیر خاص تھی بلکہ اُسکی تفریحوں میں بھی اُسکا ساتھ دیتی تھی چنانچہ شکارگاہوں میں وہ اُسکے ساتھ ہاتھی پہ بیٹھکر جاتی اور شیروں کو تیروں سے شکار کرتی [illegible] پھرتی اور چابکدستی کیساتھ کہ بعض اوقات جہانگیر بھی منہ دیکھتا رہ جاتا چنانچہ ایک روز شہنشاہ جہانگیر اپنی بیگم یعنی نورجہاں کے شکار کو گیا جنگل میں چار شیر گھیر کر لائے گئے۔ نورجہاں نے کہا کہ میں گولی لگاؤں گی۔ بادشاہ نے مسکرا کر کہا تم عورت ہو شیر کا شکار مردوں کا کام ہے۔ یہ الفاظ [illegible] کے منہ سے نکلے ہی تھے کہ نورجہاں کی بندوق سے گولی نکلی اور [illegible] کرکے چاروں شیروں کو چت کردیا۔ نورجہاں اپنی اس چابکدستی اور پھرتی سے خود پھڑک اٹھی اور اس کی زبان سے برجستہ یہ ذو معنی شعر نکل گیا۔

نورجہاں گرچہ بصورت زن است　　در صف مرداں زن شیر افگن است

اگرچہ مصرع ثانی میں زن شیر افگن کے ابہام سے جہانگیر چونکا لیکن چونکہ نورجہاں نے حقیقت میں اوسوقت شیروں کو مار کر گرایا تھا کچھ نہ کہہ سکا اور اپنے گذشتہ دغابازی یاد کرکے نادم ہو کر رہ گیا۔ شکار میں اسقدر مشق پیدا کرنے کی وجہ نہ صرف وہ ابتدائی مشق و تعلیم تھی جس نے نورجہاں کو فنون سپہ گری سے ایک حد تک واقف کار بنا دیا تھا بلکہ شیر افگن جیسے دلیر و دلاور

اور جنگجو بہادر کی معیت وصحبت نے اسے ان کاموں کا ذاتی تجربہ
بہی کرادیا تہا۔ اور بردوان کے جنگلوں میں وہ اکثر اپنے شوہر کے ساتھ شیر ببر
کا شکار کہیلا کرتی ہتی۔ نورجہاں کی زندگی چونکہ شروع سے شاہانہ زندگی
کے دوش بدوش رہی، اور اوس کے خمیر میں شاہی خو بو خاندانی طور پر موجود
ہتی اس لئے اب جہانگیر کے حرم میں داخل ہو جانے کے بعد اوسے کسی قسم کے
تصنع اور بناوٹ سے کام لینے کی ضرورت نہ پڑی بلکہ اوسکی ہر ادا اور ہر وضع
شاہی اطوار و اخلاق کا بنا بنایا نمونہ ہتی

مذہب

نورجہاں مذہبًا تو مسلمان ہتی مگر عقائد کی رو سے وہ بڑی پکی شیعہ ہتی اور
شیعیت ہی کا اثر تہا کہ ایران سے بڑے بڑے شیعہ مجتہد اور علما جہانگیر کے دربار
میں بلائے گئے تھے اور بہت سے شیعہ فضلا خود نورجہاں کی خدمت میں مامور ہتو
تھے۔ وہ مجالس محرم شریف اور چہلم میں ہزاروں کی روپیہ صرف کردیتی ہتی اور
اونہیں بارونق بنانے میں کوشش کرتی ہتی۔ اکثر معلموں کو ہر سال مکہ معظمہ
حج کے لئے اور مدینہ منورہ نجف اشرف کربلائے معلی مشہد مقدس وغیرہ وغیرہ مقامات
میں بغرض زیارت اپنے صرف سے بہجواتی ہتی۔ حضرت قاضی نوراللہ شستری
بہی جنکا مزار آگرہ میں دیوانی کچہری کے پاس واقع ہے اور جو اہل التشیعہ میں ایک
بہت بڑے مجتہد بزرگ تھے۔ نورجہان کے ایما ہی سے یہاں ایران سے
تشریف لاتے تھے اور ایسے ایسے بیسیوں صاحب کمال اوسکے دامن دولت
سے وابستہ تھے جنکو ہزاروں روپیہ ماہانہ وظیفہ ملتا تہا۔ اور انکا احترام بادشاہ خود بہی

کرتا تھا۔ گو جہانگیر اور جہانگیر کا سارا دربار سنّی تھا۔ مگر ایک نورجہاں کے شیعہ ہونے سے
اسکے دربار میں بھی شیعیت کا رنگ چھڑک رکھا تھا۔ ویسے مقدس مقامات کے
تبرکات جمع کر لئے تھے۔ جو ایک خاص جگہ بصد احترام رکھے گئے تھے۔ خاص مواقع پر
نورجہاں اون تحایف کی زیارت کیا کرتی تھی نورجہاں کے حکم و ایما سے بہت سے
شیعہ مدبر اراکین سلطنت میں بھی داخل کر لئے گئے تھے۔

عفت نورجہاں

اسمیں شک نہیں کہ مسلمان سریر آرایان سلطنت کے محلوں میں پردہ کا نہایت
موزوں انتظام رہا کرتا تھا اور مردوں اور عورتوں کے اخلاق میں تہذیب کی
جھلک بہت زیادہ نظر آتی تھی تاہم نورجہاں کی عفت کوشی قابل داد تحسین ہے
کہ چودہ برس تک حرم شاہی میں رہی لیکن اپنی عفت کو للچائی ہوئی نگاہوں سے بچایا
عیش و عشرت کی بادشاہ کدوں میں کیا کمی تھی دنیا کے جذبات انگیز سامان
ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہتے تھے اور گو وہ اس عمر تک کیفیت شباب کی لذت
چش نہ تھی تاہم کتابوں کے دیکھنے اور دن رات کے مطالعہ سے اوس پر یہ اچھی طرح
ظاہر تھا کہ جوانی کی کیفیت کو مردانہ ہاتھوں کے جسکی ضرورت ہے۔ پھر بھی تمام
شاہزادگان قلعہ سے اوسنے اپنی عفت کو محفوظ رکھا اور کبھی اسکوچہ میں قدم نہ رکھا
جس میں ہر ہر قدم پر رسوائی اور ذلت کے کنوئیں موجود ہوتے ہیں۔ وہ جہانگیر کی
نگاہوں میں جگہہ پانے سے پہلے صرف عورت تھی اور صرف عورت ہونا بہت ممکن
تھا کہ اسکو غلط راستہ پر لگا کر طمع اور حرص و ہوا کا بندہ بنا دے مگر شرافت نفس

نے اوسے عزت نفس پر مجبور کر رکھا تھا اور وہ عابدہ اور زاہدہ لڑکیوں کی طرح اپنی
عفت وعصمت کی نگاہداشت میں بہت زیادہ توجہ گذار رہتی تھی۔ اسکی عفت کوشی
اور عصمت اندوزی کا امتحان خدا نے اسوقت بھی لیا جبکہ وہ شیر افگن خان کے
مرنیکے بعد شاہی نظر بند ہوکر سلطانہ سلیمہ بیگم کے گھر میں رہی اب وہ لذت شباب
اور کیفیات جوانی سے لذت آشنا ہو چکی تھی اور شیر افگن کی گرمجوشانہ صحبتوں نے
اوسکے جذبات کو نسیم کے ساتھ ابھار دیا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ وہ یہاں آتے ہی
جہانگیر کے محلوں میں اوسکے ارادہ وتمنا کے موافق داخل ہوجاتی، یا دیگر شاہزادگان
شاہی وارکین سلطنت میں سے کسی کو اپنے قابل سمجھ لیتی مگر واہ رے عصمت کہ
نورجہاں نے کامل دو سال صبر وتحمل میں کاٹ دیے۔ اور زبان سے کیا اشارتاً
وکنایتاً بھی اپنے جذبات کی پراگندگی وہیجان کا اظہار نہ کیا اس عرصہ میں برسات
بھی آئی جاڑے بھی آئے گرمیاں بھی آئیں بہاروں نے دنیا کے باغوں میں جھولے
ڈلے جھولوں میں مستانہ پینگیں بھی پڑیں مجلس شاہی میں نغمہ سرایاں بھی ہوئیں
ناکتخدا لڑکیوں کے بیاہ بھی ہوئے مگر یہ غریب عصمت کی دیوی صبر وضبط کئے ہوئے
دو برس تک خاموش ہی بیٹھی رہی۔ اس زمانہ سکونت میں جہانگیر نے اوسے قابو میں
لانے اور اپنی ملکہ بنانے کی سیکڑوں کوششیں کیں لیکن نورجہاں کی عفت نے
اون سب کو ناکام رکھا یہی وجہ تھی کہ جہانگیر کے دل میں نورجہاں کی محبت روز افزوں
ترقی کرتی جاتی تھی اور وہ جسقدر اغماض کرتی تھی اتنی ہی آتش شوق تیز ہوتی تھی
اور وہ جسقدر اوسکا خاندانی ورثہ تھی اوسکی ماں کا نام عصمت النسا بیگم تھا جس نے
اوسے طفلی ہی سے عصمت کا سبق حفظ کرادیا تھا اور جسکی نگرانی اوسکی عصمت وعفت

کو محفوظ رکھنے کیلئے گویا ایک خاص سبب تھی جسنے نورجہاں کو معصوم رہنے میں بہت زیادہ مدد دی

نور محل

قلعہ شاہی میں نورجہاں کو ایک خاص محل دیدیا گیا جسکا نام نور محل تھا اس محل کو زیبایش دینے اور سجانے میں ہر ممکن کوشش کی گئی تھی اور گویا یہ کوئی خاص امتیاز دوسرے محلوں سے نہیں رکھتا تھا تاہم نورجہاں کی جدت پسندیوں نے اسکے در و دیوار کو روشن فروش بنا رکھا تھا۔ تمام محل کی عورتیں اور کنیزیں ہر وقت انتظار تہذیب و ترصیع میں لگی رہتی تھیں۔ صفائی کا یہ عالم تھا کہ نگاہیں پڑنے سے بھی فرش میلا تھا۔ محل کے کئی حصے تھے مثلاً پھول محل گلکدہ سوسن منزل، لالہ چہر، وغیرہ وغیرہ خلوت کدہ خاص میں روز خوشرنگ اور خوشبودار تازہ پھول منول صرف ہوتے تھے پھولوں سے قسم قسم کی گلکاریاں کبھی قالین کبھی ... بنائی جاتی تھیں۔ کلیوں سے دروازے کے پردے بنائے جاتے تھے اور پھولوں پر کلیاں اسطرح چنی جاتی تھیں کہ اگر شمع گل کر دی جائے تو یہ معلوم ہو کہ چاندنی چھٹکی ہوئی ہے ہزاروں قسم کے فانوس اور قد آدم آئینے سے سجے جاتے تھے۔ فانوسوں میں رات کو ہزاروں قسم کی روشنی ہوتی تھی۔ دیواروں پر جو سنہری بیل بوٹے صناعان عجم و ہند کی اعلیٰ دستکاریوں سے بنائے گئے تھے وہ اس روشنی میں ایسے بے نظیر اور لاجواب معلوم ہوتے تھے کہ دیکھنے والے کی نگاہیں حیران رہ جاتی تھیں اور یکایک چکا چوند سا پیدا ہو جاتی تھی۔ آہ آج کوئی اس بہشت پیکر نور محل کو دیکھے نہ وہ سامان ہیں نہ وہ گلکاریاں ہیں۔ فانوس اور آئینے

تو خیر عہد سلطنت کی نمائشوں کے ساتھ ساتھ گئے۔ مگر در و دیوار کے نقوش زرین بھی خاک میں ملے ہوئے پڑے ہیں، جہاں نورجہاں کلیوں کی سیجوں پر خواب ناز میں مصروف ہوتی تھی وہاں ابابیلوں اور چمگادڑوں نے اپنے آشیانے بنالئے ہیں جہاں عطر کے قرابے اور گلاب کے شیشے دن رات کھلے رہتے تھے وہاں اب بغیر ناک بند کے جانا مشکل ہے جہاں رات کو بھی صبح فردوس کا عالم رہتا تھا وہاں آج دن کو شب دیجور کی سی تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ آہ! مکڑیوں سے کون کہے کہ جن دیواروں پر تم نے جالا تنا ہے یہ دیواریں نورجہاں کے رخسار رنگیں کا آئینہ ہیں۔ انہیں اُسکے حُسن عالمتاب کی یادگار رہنے دو، انگوٹھوں میں تم اپنا سفید جال نہ بچھاؤ جنمیں اوس کے پھولوں کی مہک برس رہی ہے۔ افسوس! ابابیلوں چمگادڑوں کو کون سمجھائے کہ جن مقامات پر تم بیٹ اور مینگنیاں پھیلا رہی ہو یہاں کل یہاں [illegible] اور زیور رکھتی تھی۔ اور یہاں اوسکا فرش خواب بچھتا تھا یہاں [illegible] تھی، یہاں وہ بیٹھتی تھی، اور یہاں اپنے عطر آگین جسم نازک سے نور اور سرور کی کرنیں ڈالا کرتی تھی۔ آہ انقلاب نے اُن تمام آرائشوں کو خاک میں ملا دیا۔ اگر نورجہاں اب پیدا ہو اور قلعہ میں آکر اپنے محلوں کی حالت زار دیکھے تو اوسکو کبھی یقین نہ آئے کہ ایک دن یہ اُجڑے ہوئے ویرانے اوسکے برکت اندوز قدموں سے آباد تھے اور وہ یہیں دلوں پر حکومت و شاہی کرتی تھی

کیسا اورنگ شہی کیسا شکوہ سلطنت	کیسا ایوان مرصع کیسا قصر دلربا
سیر کے قابل نہیں دنیا کا کوئی سین آہ	ہے تماشہ گاہ ہستی ہی عجب عبرت سرا
کون چن کر لیگیا وہ پھول اس گلزار سے	چار دن کلیوں کے ہنسکر دل جو بہلایا تو کیا

کیسا جیغہ کیسا طرہ کیسی کلغی کیسا تاج | تخت شاہی پھر کہاں جب آگئی سر پر قضا

لیگیا سر پر اٹھا کر افسر دانہ تنگ کون | چل بسے دار فنا سے سینکڑوں فرمانروا

وہ ملوک ہفت کشور وہ شہ والا نژاد | جن کی نصرت کا علم لہرا رہا تھا جا بجا

کانپتے تھے جن کی صورت سے زمین آسمان | جنکی سطوت دیکھکر شیر دلوں کا زہرہ آب تھا

جنکے در پہ بج رہا تھا روز و شب کوس ظفر | جنکے سر پر تھا ہما اقبال کا سہرا سج رہا

ہاتھ آیا ہستی فانی سے کچھ بھی وقت مرگ | لے گئے دنیا سے کچھ بھی پاس حسرت کے سوا

ہیں یہ سب دنیا کے جھگڑے ورنہ غافل بے برگ | کون آیا دیکھنے کو تخت زریں کیا ہوا

ایک مرقع خواب تھا وہ طلسم دل فریب | کچھ بھی آتا ہو نظر اب خاک پتھر کے سوا

اب نظر آتا نہیں وہ تخت اورنگ جیغہ | کان میں آتی نہیں اب کوس دولت کی صدا

اک فسانہ خواب عبرت کا ہو ایسی سرگذشت | ہستی فانی کی یہ ہے ابتدا و انتہا

پردہ داری میکند بر طاق کسریٰ عنکبوت
چغد نوبت میزند بر گنبد افراسیاب

نوروز نور افزا

چونکہ ایران میں رسم نوروز منانے کا طریقہ مدتہائے دراز سے جاری تھا اور شاہان مغلیہ ایران ہی سے ہندوستان آئے تھے اسلئے یہ رسم یہاں بھی بڑے تزک و احتشام اور پورے جشن و اہتمام سے منائی جاتی تھی۔ یوں تو نوروز کے دن قلعہ معلی میں ہر جگہ ایک نئی چہل پہل اور نئی خوشی ہوتی تھی مگر نورجہاں کے نور محل میں جو طرب اندوزی اور مسرت افروزی نظر آتی تھی اسکا پتہ قلعہ میں اور کسی جگہ نہ ہوتا

تھا۔ نورجہاں شیعہ بھی، اور چونکہ نوروز کے دن حضرت علیؓ ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ
عنہ مسند خلافت پر رونق افروز ہوئے تھے اسلئے نوروز کی خوشی میں نورجہاں خاص
حصہ لیتی تھی۔ اور عیدین کے دن سے زیادہ نوروز کے دن جشن ہوا کرتا تھا جسکے
انتظام میں وہ ہزاروں روپیہ سیر چشمی اور کشادہ دلی کے ساتھ صرف کر دیتی تھی۔
منجم جو رنگ نوروز کے لئے مخصوص کر لیتے تھے محل کی ہر چیز پہ وہ ہی رنگ چھایا
ہوا نظر آتا تھا۔ مثلاً کسی سال کیلئے سرخ رنگ قرار پاتا تو تمام محل میں سرخ رنگ
کا فرش بچھایا جاتا سرخ رنگ کی چھت گیریاں لگائی جاتیں سرخ ہی رنگ
کے پردے ڈالے جاتے تھے اور نورجہاں بھی اس روز سرخ رنگ کا جوڑا زیب جسم
کرتی سرخ رنگ کے زیورات مرصع پہنتی تمام کنیزیں، غلام، خواجہ سرا، چوبدار
وغیرہ بھی سرخ لباس پہنتے۔ ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، پالکی، رتھ، بہلی، تمام
سواریوں کے غلاف بھی سرخ ہوتے تھے، اور یہ تمام سرخ کپڑے علی قدر مراتب
نورجہاں کی سرکار سے ملتے تھے۔ سات روز تک جشن نوروز قلعہ معلی میں نورجہاں
کے دم سے رہتا تھا۔ خود شاہنشاہ جہانگیر نورجہاں کی مسرتوں میں شریک ہوتے
اور ایک خاص وقت دونوں مالک و ملکہ شہ نشین پہ بیٹھتے۔ امراء و روساء اور اہل
کمال اپنی اپنی جگہ رونق گزیں ہوتے، ارباب سوال پہ سوال کرتے، اور اصحاب
کمال قصیدے اور تہنیت نامے لکھکر نذر دیتے سوا لاکھ روپیہ فرق مبارک
کے تصدق میں نورجہاں اپنے پاس رکھتی۔ جو عین وقت جشن فقرا اور کملا میں
تقسیم کیا جاتا تھا۔ سات دن تک سارا آگرہ دربار نورجہاں سے مستفیض ہوتا تھا
ہر شخص کی درخواست والتماس پہ نورجہاں نوروز کے دن خاص التفات اور توجہ

دیتی اور سینکڑوں نامراد بامراد ہوکر اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے قوال بھانڈ
منجم تال نقارچی شہنشاہی نواز اسقدر انعام و اکرام پاتے تھے سال بھر کے
لئے فارغ المعاش ہو جاتے تھے۔ شاہی اُمرا اُس روز نورجہاں کے مہمان ہوتے
اور تمام شاہی محل کی مخدرات عصمت مآب نورجہاں کے محل میں رونق افروز
ہوتیں۔ نورجہاں سب سے مصافحہ کرتی اور اون کی خاطر داشت میں کوئی دقیقہ
اوٹھا نہ رکھتی۔ پبلک کی دلچسپیوں کا بھی خاص خیال رکھا جاتا تھا یعنی انہیں
سات دنوں میں سے ایک دن نورجہاں اور شہنشاہ جہانگیر چلمنیں ڈال کر ثمن
برج میں رونق افروز ہوتے اور نیچے لب دریا ہزاروں دوکانیں بہترین نمایش و
آرایش کے ساتھ کھولی جاتیں۔ پھر سامنے سے شہسوار، فیلبان اپنے اپنے کرتب
دکھاتے ہوئے نکلتے۔ قواعد داں مبارک باد اور سلامی کا باجا بجاتی ہوئی اور مجرا
کرتی ہوئی اوسطرف سے گذرتی۔ حلوائی قسم قسم کی مٹھائیوں سے دوکانوں کو
آراستہ کرتے کوئی میٹھائی کا درخت بناتا کوئی میٹھائی کا قلعہ تیار کرتا اور یہ سب کچھ
بادشاہ اور ملکہ کی آنکھوں کے سامنے لٹا دیا جاتا۔ ان سب کو حسب حیثیت انعام
ملتا تھا۔ لنگرخانہ سات دن تک جاری رہتا کہ جسکا جی چاہے آئے اور کھائے
فقرا اور مساکین کے لئے یہ حکم تھا کہ وہ پبلک کے ہنگامے میں نہ آئیں کہ انہیں
بھی زحمت ہو اور پبلک کو بھی تکلیف اوٹھانی پڑے اونکے لئے یہ انتظام تھا کہ شاہی
پہرے دار انہیں ناکوں پر روک لیا کرتے تھے اور وہیں انہیں کھانے پینے
کی اشیاء اور کچھ زر نقد ملجایا کرتا تھا۔ اسطرح شہر میں کوئی بدنصیب سے بدنصیب
شخص بھی نورجہاں کی دریا دلی اور نوروز کی فیض رسانی سے محروم نہ رہتا۔ لوگ

سال بھر تک اس جشن کے مزوں کو یاد کیا کرتے تھے اور اکثر ہنرمند سال بھر تک
اس دن کے لئے نئی نئی قسم کی چیزیں بنانے اور مہیا کرنے میں مصروف رہتے تھے
سات دن تک تمام کاروبار بند رہتے تھے اور دور دور سے خلقت خدا اس نورجہانی
نوروز کی دید کے لئے آتی تھی اور دامن نگاہ میں دوبارہ آنے کی تمنا بھر کر لیجاتی تھی

نوروز کا گدہا

ایکمرتبہ ایک سادہ لوح مولوی صاحب کو عجب دل لگی سوجھی اونہوں نے سوچا
کہ لڑکوں کو پڑھاتے پڑھاتے مدتیں گذر گئیں چلو آج تو نوروز کی سیر کریں کوئی ایسا
سوانگ بنا کر لے چلیں کہ نورجہاں اور شہنشاہ دیکھتے ہی لوٹ ہو جائیں اتفاق سے
اس سال بحساب نجوم نوروز کی سواری میں گدہا تھا اور رنگ زرد نوروز کے لئے
مقرر تھا۔ بس مولوی صاحب نے ایک گدہا پکڑا۔ اوسے زرد رنگا اور خود بھی زرد رنگ
کے کپڑے پہنے ایک کاغذ کا مکٹ سر پر رکھا اوسمیں بہت سے شیشے کے ٹکڑے لگا
لئے۔ اور پنی ہر طرف چپکالی چہرہ پہ بھی پنی لگالی اور اسے زرد رنگ لیا۔ پھر اوس گدہے
پر بیٹھکر آپ ہنستے اور مسکراتے سلام کرتے اور تالیاں بجاتے قلعہ شاہی کے
نیچے سے نکلے۔ دو لڑکوں کے ہاتھ میں اوس گدہے کی رسی تھی مولوی صاحب
باریش وفش اور پر رونق افروز تھا جو دیکھتا تھا ہنستے ہنستے لوٹ جاتا تھا جب یہ
گدھا ثمن برج کے نیچے سے نکلا تو مولوی صاحب کے شاگرد ڈپٹی کی طرح چلانے
لگے کہ آج "نوروز کا مبارک جلوہ دیکھو" بار بار یہی آواز لگاتے تھے اور مولوی صاحب
ہنستے اور سلام کرتے جاتے تھے۔ یکایک نورجہاں کی نگاہ جو اوپر پڑی تو

بے اختیار ہنس پڑی، اور حکم دیا کہ اس نوروز کے گدہے کو پانچسو روپیہ انعام دیئے جائیں

ملا نوروز

اسی طرح ایک مولوی صاحب تھے جو برسوں سے اکبر آباد میں آباد تھے اور سنا کرتے تھے کہ نوروز کے دن شاعروں کو بڑے بڑے انعام ملتے ہیں ایک مرتبہ نوروز کے موقعہ پر مولوی صاحب مرزا محمد تقی بخشی کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مرزا صاحب آپ تو ہر سال نوروز کے دن خلعتیں اور انعام و اکرام لاتے ہیں اب کے تو ہمیں بھی کوئی قصیدہ غزل یا رباعی لکھ دیجئے اور ایسی لکھ دیجئے کہ نورجہاں سنتے ہی پھڑک جائے۔ مرزا تقی نے کچھ شعر لکھ دئے جنہیں لیکر مولوی صاحب بڑے کر و فر کے ساتھ دربار میں پہنچے مرزا تقی نے مولوی صاحب کے علم و فضل کا حال حاشئے پر چڑھا کر پہلے ہی کہہ رکھا تھا۔ حکم ہوا کہ پڑھو۔ مولوی صاحب مرزا تقی صاحب کا منہ دیکھتے ہوئے ڈرتے کانپتے آگے بڑھے۔ کبھی شاہی رعب داب سے انکے حواس گم ہو جاتے تھے اور کبھی دولت حاصل کرنے کی امید ان کی ہمت بندھا دیتی تھی غرضکہ اسی امید و بیم میں انکی زبان کھلی اور انہوں نے پوری قرات کیساتھ اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھی ان کی قرات پر نورجہاں کو ہنسی آئی مگر وہ ایک وقار کیساتھ خاموش ہوگئی اب مولوی صاحب نے یہ رباعی بھی قرات سے پڑھنی شروع کی رباعی

امروز کہ روز سعد باشد بہ مثل — بنشست علیؓ بمسند حسن عمل
از جلوۂ مہر گشت عالم پر نور — ایوان جہانگیر شدہ نور محل

نورجہاں یہ رباعی سنکر خوش تو ہوئی مگر مولوی صاحب سے کہنے لگی کہ رباعی بیشک

اچھی ہے لیکن "سعد" کا نام حضرت علیؓ کرم اللہ وجہ کے نام سے پہلے لانا ٹھیک
نہیں۔ مولوی صاحب یہ سمجھ کر کہ نورجہاں اس رباعی سے ناراض ہو گئی کہنے لگے کہ
حضور میں نے ایک رافضی سے یہ شعر لکھوائے ہیں اسمیں میرا کچھ قصور نہیں ہے
اس ظالم نے میرے ساتھ یہاں بھی مذہبی تعصب نکالا مجھے کیا خبر تھی کہ وہ رباعی
یہ نقطہ آگے پیچھے کریگا۔ حضور میں قسمیہ عرض کرتا ہوں کہ یہ رباعی میری نہیں ہے
یہ سنکر نورجہاں اور بھی ہنسی اور کہنے لگی کہ اچھا جس سے شعر لکھوائے اوسے بلواؤ
مولوی صاحب نے مرزا محمد تقی کیطرف اشارہ کیا۔ مرزا صاحب آئے اور وہ شعر اُن
سے پھر پڑھوائے گئے۔ تو مولوی صاحب نے کہا دیکھئے حضور انکو ابھی پڑھنے کی بھی
تمیز نہیں ہے سعد اور علیؓ کے عین کو حلق سے نکالنا چاہئے اور اونہوں نے زبان
سے ادا کیا۔ نورجہاں سمجھ گئی کہ مولویصاحب محض اک سادہ لوح بزرگ ہیں۔ پانچسو
روپیہ اور ایک قبا سے رومی دیکر رخصت کیا اور مولویصاحب کا نام ملا نوروز رکھدیا۔ پھر
تو ملا نوروز کی قسمت جاگ گئی۔ وہ ہر نوروز میں پہنچ جاتے اور نورجہاں ان کی ظرافت
اور بھولے پن سے خوش ہوکر اونہیں ہمیشہ انعام دیتی۔ مولوی صاحب سال بھر تک
اپنا لباس اسی رنگ کا رکھتے تھے جس رنگ کا نوروز کے روز پہنتے تھے۔ اور ایک
خاص وضع کی ٹوپی سر پر پہنتی تھی جسمیں رنگے ہوئے پر لگے رہتے تھے۔ شہر کا بچہ بچہ
اونہیں جان گیا تھا اور سب میں وہ ملا نوروز کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ ان
کی یہ سادہ لوحی اس تدبیر سے اونہیں ہر سال سینکڑوں روپیہ کا فائدہ کرا دیتی
تھی جہاں نوروز آیا اور مولوی صاحب کسی سے رباعی یا قصیدہ کہلوا کر دربار
میں پہنچے۔ مگر اُس دن سے پھر کبھی مرزا محمد تقی سے درخواست نہ کی۔ ان مولوی

صاحب کا نام غالباً نورالہدی تھا۔ اس سے زیادہ حالات انکے دستیاب نہیں ہوتے۔

نورجہاں کی ہمدردی بیواؤں و یتیموں سے

نورجہاں اس قسم کے مراسم اور جشن اور مجالس ہی میں اپنا روپیہ صرف نہیں کرتی تھی بلکہ وہ بہت زیادہ روپیہ یتیموں اور بیواؤں کے درماں میں بھی خرچ کرتی تھی۔ ہزاروں یتیم بچے اوسکے یتیم خانے میں پرورش پاتے تھے اور ہزاروں بیوہ عورتوں کے نکاح اوس کے صرف خاص سے پڑھوائے جاتے تھے۔ وہ اس مسکین جماعت میں "شاہ مادر" کے نام سے مشہور تھی۔ یہہ یتیموں کا انتظام گو دیگر منتظمین کے سپرد تھا تاہم ہر ہفتہ وہ بہ نفس نفیس خود بھی ان کا ملاحظہ اور معائنہ کرتی تھی اور انکی تکالیف اُن کی زبان سے سنتی تھی اور درماں ہی کی کوشش کرتی تھی اونکے آرام [illegible]ت کا اُسے بہت بڑا خیال رہتا تھا۔ اور وہ یتیموں اور بیواؤں کی دعاؤں کو اپنے لئے موجب نجات اور سبب خیر و برکت سمجھتی تھی۔

نورجہاں کی حاضر جوابی

شاہی محلوں کا رہنا سہنا شہزادوں کی ہم جلیسی علم و فضل اور کمال بہتات نے نورجہاں کو حاضر جوابی میں خاص مشاق بنا دیا تھا۔ اوسے کسی بات کا جواب سوچنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی تھی وہ فطرتاً طباع اور بذلہ سنج عورت تھی اور دیگر شاہی خواتین سے اس خصوص میں اوس کا ذہن رسا بہت زیادہ بڑھا ہوا تھا۔

تذکرۃ الفقرا میں لکھا ہے کہ علی شاہ درویش کو جب نورجہاں کے فضل و کمال کا علم

ہوا تو وہ ایک دن قلعہ کے پاس پہنچے اور چاہا کہ کسی طرح نورجہاں تک رسائی حاصل ہو مفلوک الحال تھے اور انقلاب نے ان کی حالت کو ردی کر رکھا تھا۔ گدڑی کاندھے پر ڈالے ہوئے جا ہی پہنچے۔ مگر اب وہاں تک جائیں تو کیوں کر۔ کئی دن اس حسرت میں گذر گئے روز جاتے اور قلعہ کا چکر لگا کر چلے آتے۔ ایک دن نورجہان اپنے باپ مرزا غیاث کے پاس آئی ہوئی تھی اور شام کے وقت پائیں باغ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گلگشت میں مصروف تھی۔ نورعلی شاہ کو خبر ملی کہ وہ آج قلعہ میں نہیں ہے بلکہ اپنے باپ کے گھر ہے فوراً ہی تو پہنچے اور باغ کی دیوار کے پیچھے کھڑے ہو کر زور سے ایک آواز لگائی

گر از دل من روشنی نور بر آید

ہر ذرہ تجلی دہ صد طور بر آید

نورجہاں اس قسم کی صداؤں سے خاص دلچسپی رکھتی تھی جن میں اوس کے نام کا کوئی لفظ استعارتاً یا اشارتاً آجاتے۔ اوس نے اس صدا کو سُنا تو ایک کنیز سے کہا دیکھو باغ کی دیوار کے پیچھے کوئی شخص ہے اسے اندر لے آؤ۔ کنیز گئی تو دیکھا ایک گدڑی پوش فقیر کھڑا ہوا دیوار سے باتیں کر رہا ہے۔ کہنے لگی چلئے سرکار بلاتی ہیں۔ فقیر تو یہ چاہتا ہی تھا فوراً ساتھ ہو لیا۔ باغ میں پہنچا تو نورجہاں پردہ کی آڑ میں کھڑی ہو گئی اور پوچھنے لگی کہ تمہارا کیا سوال ہے۔

فقیر۔ میں تو ایک غریب فقیر ہوں اور خدا کے گھر (بیت اللہ) جانا چاہتا ہوں۔

نورجہاں۔ مگر خدا غریب کو اپنے گھر کی طرف آنے کی اجازت نہیں دیتا۔

فقیر۔ تو مائی اپنے آستانہ پر پڑا رہنے دے۔

نورجہاں۔ میں تو خود شہنشاہ کے گھر میں رہتی ہوں۔

فقیر۔ تو مجھے بھی بادشاہ کے گھر میں جگہ دلوا دے۔

نورجہاں۔ بھلا وہاں فقیر کے رہنے کا کیا کام ہے۔

اتنے میں ایک خواص بول اوٹھی کہ یہ موا فقیر گستاخ ہے ہماری سرکار سے باتیں بنائے چلا جاتا ہے فقیر بولا کہ تمہاری سرکار مجھ سے زیادہ چالاک ہیں کہ نہ تو فقیر کو اپنے پاس رکھتی ہیں نہ بادشاہ کے گھر میں جگہ دیتی ہیں نہ خدا کے گھر جانے دیتی ہیں یہ سنکر نورجہاں بے اختیار ہنس پڑی اور فقیر کو ایک ہزار روپیہ نقد اور ایک سنہری کڑوں کی جوڑی اسی وقت عطا فرمائی اس سے نورجہاں کی مسکین نوازی کے ساتھ اوسکی حاضر جوابی کا بھی پورا ثبوت ملتا ہے۔

ایک مرتبہ رمضان کا مہینہ ختم ہوا اور عید کا چاند نکلا تو شہنشاہ جہانگیر نے چاند دیکھ کر نورجہاں سے مسکرا کر فرمایا۔

ہلال عید براوج فلک ہویدا شد

نورجہاں نے فوراً یہ مصرع برجستہ کرکے جواب میں سنایا۔

کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد

ایک مرتبہ بادشاہ اپنے شاہی باغ میں مصروف سیر تھے نورجہاں بھی ساتھ ہی ایک جگہ چار مخدرات محل شاہی کھڑی ہوئی تھیں جہانگیر نے ان عورتوں کو دیکھ کر نورجہاں سے مخاطب ہوکر کہا۔

ہر چار عناصر گرامی ہستند

نورجہاں نے دوسرا مصرع فوراً اس طرح نظم کرکے سنایا۔

شہ جاں ہمہ ز نشہ سرمستند

ایک مرتبہ شہنشاہ جہانگیر نے سفید حریر کی قبا زیب بدن کی اور اسمیں لعل رمانی کا بٹن لگایا اور نورجہاں کے پاس آیا نورجہاں نے دیکھتے ہی یہ شعر موزوں کیا

ترا نہ تکمہ لعل است در قبائے حریر — شد است قطرۂ خون منت گریباں گیر

یہ حکایت بھی مشہور ہے جو نورجہاں کی ذہانت و دانائی پر دال ہے کہ ایک مرتبہ دو ایام سے تھی کہ شہنشاہ جہانگیر نے اظہار شوق کیا۔ نورجہاں نے اسکے جواب میں اسطرح عذر کیا۔

بجوں من اگر شاہا دلت خوشنود می گردد

بجان منت اے تیغ تو خوں آلود می گردد

جہانگیر اس عذر دربردہ کو سمجھ کر خاموش ہوگیا۔ ایک مرتبہ پھر ایسا ہی اتفاق ہوا تو نورجہاں نے عرض کیا۔

بظاہرم منگر گرچہ سر بسر سبزم — ولیک باطن من چوں حنا پر از خون است

تیسری مرتبہ پھر ایسا ہی موقع پیش آیا۔ نورجہاں نے اس مطلع سے پھر دوبارہ عذرخواہی کی۔

دست زگل چیدنم امشب بدار — میچکد از برگ گلم آب نار

ان تمام واقعات سے نورجہاں کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کا پورا پورا ثبوت ملتا ہے

نورجہاں شاعر بھی تھی

حسن اتفاق سے نورجہاں کے عہد طفلی میں چند اتالیق ایسے مقرر ہوئے تھے جو اس زمانہ کے زبردست شاعر تھے اور گو نورجہاں نے باقاعدہ اس فن کو کبھی

اوستادسے حاصل نہیں کیا تھا تاہم وہ دیوان اور فارسی کلیات وغیرہ دیکھہ
دیکھہ کر خود بھی کبھی کبھی کچھہ لیا کرتی تھی۔ اوسنے اپنا کلام کسی کو بغرض اصلاح
نہیں دکہایا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ محلات شاہی میں شاعری معیوب سمجھی جاتی
تھی بلکہ وہ اپنے خداداد ذہن پر نازاں تھی اور اپنی طبیعت سے خود مدد لیکر
اس فن مبارک میں ترقی کرنا چاہتی تھی۔ جب اوسکے خودساختہ اشعار سنکر شہنشاہ
جہانگیر خوش ہوتے تو اوسکا حوصلہ اور بھی بڑھ جاتا تھا اور طبیعتًا اوسے اس فن
مبارک میں ترقی کرنا چاہتی تھی جب اوسکے خودساختہ اشعار سنکر شہنشاہ
جہانگیر دسی زبان میں ستے۔ کہتے ہیں کہ شیر افگن خاں اپنے شوہر کے قتل ہوجانے
پر اوس نے ایک بسیط مرثیہ بھی لکھا تھا۔ مگر افسوس کہ اوسکا کوئی شعر کسی شعر
میں نظر سے نہیں گذرا۔ اوسکی شاعرانہ ترقی کا سبب اوسکی ہمعصر خواتین بھی تھیں
جنمیں سے بعض نہایت خوشگو شاعرہ تہیں اور اونکی صحبت وہم جلیسی میں رہکر
اوس کے لئے ناممکن تہا کہ وہ اس شوق سے محفوظ رہے۔

نورجہاں کا کوئی دیوان مکمل مطبوعہ یا غیر مطبوعہ ہمیں کہیں نظر نہیں آیا۔ اوسکے
بعض اشعار جو اوسکے نام سے منسوب ہیں مورخ نے نقل کئے ہیں اور انہیں
سے اوسکی شاعرانہ قابلیت پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے بعض اشعار جو ہمیں
اکثر تواریخ معتبرہ میں ملے یہاں بھی نقل کئے جاتے ہیں۔

دل بصورت ندہم تا نشدہ سیرت معلوم ‏ بندۂ عشقم و ہفتاد و دو ملت معلوم
زاہدا ہول قیامت مفکن در دل من ‏ ہول ہجران گذرانیدم و قیامت معلوم

چہ زاہد کہ جام بادہ گلگوں بکف داشتم — مردود کعبہ گشتم نشستہ بخون جگر خوردم

نورجہاں کی معاصر عورتوں میں سے ایک جانان بیگم بھی تھیں جو عبدالرحیم خان خاناں
کی لڑکی تھیں علاوہ شاعر ہونے کے انہیں زہد و پارسائی کا مادہ حد سے زیادہ ملا
ہوا تھا عفت عصمت پناہ خواتین کی فہرست میں زمانہ نے ان کا سب سے اول نمبر
لکھا ہے چنانچہ ایک مسلم روایت ہے کہ جب ان کے حسن اور علم کی شہرت پہنچی تو
شہنشاہ جہانگیر نے انہیں شادی کا پیغام دیا۔ بادشاہ کا پیام اور پھر ایک معمولی
ملازم شاہی کی لڑکی کے نام اس کا مان لینا خود خانخاناں کے نام باعث فخر تھا
مگر جانان بیگم نے شاہی محلوں کی بیگم بننا پسند نہیں کیا۔ اور اپنے دانت توڑ کر اور بال
کاٹ کر بادشاہ کے حضور میں بھیج دیے یہ حال دیکھ کر جہانگیر کو سخت افسوس ہوا۔
اور جانان بیگم کا کچھ وظیفہ مقرر کر دیا یہ ایک شعر ان کی طرف منسوب ہے ۔

عاشق ز خلق عشق تو پنہاں چساں کند — پیدا است از دو چشم ترش خوں گریستن

سلیمہ سلطان بیگم بھی جو بیرم خاں کی زوجہ تھیں شاعری سے خاص مذاق رکھتی تھیں ان کا
بھی ایک شعر دیکھا گیا ہے

کاکلت را گر ز مستی رشتہ جاں گفتہ ام
مست بودم زیں سبب حرف پریشاں گفتہ ام

حبیب اللہ ترک کی بیوی شفیعہ خانم بھی نورجہاں کی ہم جلیسوں میں تھیں اور شاعری
سے خاص تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی ایک رباعی مشہور ہے

روزے کہ بجواں وصل جہاں گشتم — شرمندہ ز انتظار ہجراں گشتم
زاں چشمۂ حیواں گشتہ ام آبے — از زندگی خویش پشیماں گشتم

ان واقعات کی تشریح سے مقصد یہ ہے کہ نورجہاں کے زمانہ میں خود اس کے حلقوں میں بعض نہایت خوشگو شاعرہ عورتیں موجود تھیں مگر نورجہاں کی شگفتہ طبعی اور بذلہ سنجی و ذہن رسا نے کسی کی قابلیت کا چراغ اوسکے سامنے روشن نہ ہونے دیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ جہانگیر باوجود مشکلات بھی نورجہاں کے خیال سے باز نہ آیا۔ اوسے اپنی ملکہ بنا کر رہا۔ نورجہاں شیر افگن کی بیوی بن چکی تھی وہ نا کتخدا تھی کہ جہانگیر اوس کے لئے دیوانہ ہو رہا تھا۔ مگر اوسکے حاصل کرنے کے لئے جو چیز جہانگیر کو بہت زیادہ مضطرب اور وحشی بنا رہی تھی وہ نورجہاں کی اعلیٰ قابلیت اور روشن ذہنی تھی۔ اور اسی ایک وصف نے اوسے اوسکی تمام معاصر خواتین میں ممتاز کر دیا۔

نورجہاں کی مسرتوں میں آغاز انقلاب

کبھی شادی کبھی ماتم کبھی عشرت کبھی حسرت
ہمیشہ ایک سی حالت نہیں رہتی زمانے کی

یہ زمانہ کی قدیمی خاصیت ہے کہ ہمیشہ ایک حالت پر نہیں رہتا۔ اسکے واقعات و حالات ہمیشہ متغیر ہوتے رہتے ہیں اور انقلاب دائمی اپنے اپنے جلوے دکھاتا رہتا ہے۔ کوئی بادشاہ ہو یا فقیر امیر ہو یا غریب کبھی ایک حالت میں نہیں رہ سکتا۔ نورجہاں بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھی اور اسے بھی مصائب دنیوی کا شکار ہونا پڑا۔ سب سے پہلے جس مصیبت نے اسے خستہ کیا وہ اوسکی ماں عصمت بانو بیگم کا انتقال تھا۔ عصمت بانو کی جہانگیری اور نگرانی نے نورجہاں کو ایک با سلیقہ شہزادی کی طرح پالا تھا۔ اور اوسکی اعانت و شفقت سے نورجہاں کی شہرت میں ترقی ہوئی تھی۔ عصمت بانو بیگم کو جہانگیر اپنی حقیقی ماں سے

زیادہ سمجھتا تھا اور اسکی تکریم و تعظیم اور خبر گیری میں ہمیشہ مصروف رہتا اور اسکے مرنے کا
افسوس گو سب سے زیادہ نورجہاں کو تھا یعنی جہانگیر اور نورجہاں کا باپ مرزا غیاث اور
اسکا بھائی آصف خاں بھی اس رنج سے سبکدوش نہ تھا سب مرحومہ کے شریک غم
ماتم کیے گئے تھے اور اسکی یاد اونہیں خون کے آنسو رولاتی تھی۔ آخر کار شہنشاہ جہانگیر
کی مہربانیوں اور دلجوئیوں نے اس سانحہ جانگداز کو تھوڑے دنوں سے بالکل محو کر دیا
ابھی اس واقعہ کو کچھ زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا کہ مرزا غیاث نورجہاں کے والد نے بھی اس
دنیا سے بیمار ہو کر سنہ ۱۰۳۲ھ میں انتقال کیا۔ مرزا غیاث اپنی استعداد و قابلیت
سے اور نورجہاں کے وسیلہ سے جہانگیر کے دربار میں سند وزارت تک پہنچ گیا تھا۔ اکبر
کے زمانہ میں صرف دیوان بیوتات تھا مگر جہانگیر نے اسے اپنا وزیر بنا لیا تھا اور اعتماد الدولہ
کے معزز لقب سے ممتاز کیا گیا تھا۔ اعتماد الدولہ کے مرنے سے نورجہاں کی پولیٹکل قوتوں
میں بہت زیادہ ضعف پیدا ہو گیا اور وہ ان مصائب یعنی بے بسی و بیکسی کی
مصیبتوں میں گرفتار ہو کر بہت زیادہ ضعیف ہو گئی۔ اوسکا دل ہر وقت دکھا کرتا
رہتا تھا۔ اور چہرہ اداس ہو جاتا تھا وہ خوش تھی کہ اوس کی ماں خلافت شاہی میں
ایک خاص عزت اور مرتبہ رکھتی تھی اور وہ شاد تھی کہ اوسکا باپ شہنشاہ ہندوستان
کا وزیر اعظم ہے۔ مگر اب قسمت نے ان دونوں رفاقتوں اور مسرتوں کو اس سے چھین
لیا۔ اور وہ بیکس و بے بس رہ گئی۔ جہانگیر نے بہ نظر دلجوئی وہی عہدہ نورجہاں کے باپ
مرزا غیاث کو دیا تھا۔ اب اس کے بھائی آصف خاں کو دیدیا اور آصف جاہ کے لقب
سے معزز فرمایا۔ یہ سب کچھ تھا لیکن نورجہاں کے دل میں جو داغ مرگ پدر اور انتقال
مادر سے پڑ گئے تھے۔ اونکا مندمل ہونا غیر ممکن تھا۔ ان حوادث نے اوس کی پیشانی

اعتماد الدولہ آگرہ

خاص فرمان مہابت خان کے نام جاری کیا کہ "جانتک آصف جاہ کو حساب
نہ سمجھا دو اور اپنے مظالم کا جواب نہ دے لو تیرہ موقوف اور دربار میں حاضری
مسدود" اسوقت بادشاہ مع اپنے لشکر اور آصف جاہ نورجہاں کے دریائے
جہلم کے اس پار مقیم تھا مہابت خان کو جب یہ جواب لکھا گیا تو آصف جاہ مع
لشکر و فوج دریا پار چلا گیا۔ اور بادشاہ کو مع حرم سرا اور چند خواجہ سراؤں کے
اس پار تنہا چھوڑ گیا بیشک یہ آصف جاہ کی ایک بہت بڑی غلطی تھی لیکن وہ
مراحم خسروانہ اور الطاف شاہانہ پر پھولا ہوا تھا۔ اس لئے انجام کار پر اوسنے
نظر بھی نہ ڈالی۔ نہ وہ یہ سمجھا کہ مہابت خان کس گھات میں ہے اور کس پردہ
میں اپنا انتقام لینا چاہتا ہے ادہر تو آصف جاہ دریا پار ہوا ادہر مہابت خان
پانچہزار راجپوتوں کے ساتھ شاہی کیمپ پر آپڑا کیمپ ہر طرف سے گھیر لیا گیا
اور راجپوتوں کا لشکر ہر طرف نظر آنے لگا۔ یہ غل و شور اور یہ ہنگامہ دیکھکر جہانگیر
اپنے کیمپ سے باہر آیا مہابت خان دوڑکر حاضر ہوا۔ پوچھا مہابت خان
کیا ہنگامہ ہے۔ عرض کیا کچھ نہیں حضور کی پناہ میں آیا ہوں میرا قصور معاف
کیا جاوے یہ کہکر بادشاہ پر تصدق ہوا اور پالکی منگوائی بادشاہ کو اسمیں بٹھایا
اور خود کندھا دیکر اپنے خیمہ میں لیگیا وہاں پہونچکر پہرہ کا حکم دیدیا کہ بادشاہ
نظر بند رہیں اور کسطرح یہاں سے نکلنے نہ پائیں۔ مگر پھر سے خیال آیا کہ
افسوس نورجہاں عیار رنگیلی جس کا تدارک کرنے کیلئے یہ تمام چالاکیاں اور
حیلہ سازیاں کیگئی تھیں ہاتھ نہ آئی پھر بادشاہ کو سوار کرکے شاہی کیمپ میں
لایا مگر یہاں آکر دیکھا تو نورجہاں کو نہ پایا اور معلوم ہوا کہ وہ اپنے بھائی کے پاس

دریا پار چلی گئی۔ نورجہاں جب اپنے بھائی کے پاس پہنچی تو اس نے آصف جاہ
اور سرداران لشکر کو بُری طرح لتاڑا اور اسطرح تنہا چھوڑ آنے پر لعنت ملامت
بھائی ادھر بادشاہ نے حکم بھیجا کہ نورجہاں کو فوراً یہاں بھیجدو مگر وہ نہ آئی اور
مہابت خاں کو اسکی چالاکیوں کا مزا چکھانے کی تدبیریں سوچنے لگی۔ بجز اسکے چارہ
ہی کیا تھا۔ کہ مہابت خاں کے لشکر پر حملہ کر دیا جائے۔ گو بادشاہ کے احکام
میں حملہ کرنے کی سخت ممانعت تھی تاہم وہ نہ مانی اور ایک سردار کو مع فوج
کے دریا پار اتار دیا لیکن سردار مع فوج کے [illegible] ناکام واپس آگیا۔ دوسرے دن
نورجہاں خود مقدمۃ الجیش بنی اور ایک ہودج میں ہاتھی پر بیٹھی شہریار کی
چھوٹی سی بیٹی کو گود میں لیا اور ہاتھی کو دریا میں ڈالدیا پیچھے پیچھے فوج تھی اور
آگے آگے ملکہ۔ آخر کار میدان کارزار گرم ہوا۔ ہزاروں آدمی ادھر ادھر کے
ضائع ہوئے۔ لڑکی نورجہاں کی گود میں کسی ظالم کے تیر سے زخمی ہوئی یہاں تک
کہ نورجہاں کو واپس لوٹنا پڑا۔ ان واقعات نے مہابت خاں کو حضور بادشاہ میں
فتنہ پردازی اور کینہ دوزی کا موقعہ دیا وہ کہنے لگا۔ دیکھئے حضور عالی کہ بیگم صاحبہ
آپ کی موجودگی سے واقف نہیں اور جانتی نہیں کہ آپ یہاں بنفس نفیس موجود ہیں
پھر بھی آپ کی کچھ پرواہ کی نہ آپکے احکام پر توجہ کی اور آپ کے خلاف کام کیا اور
بلکہ بیسیوں ہزاروں آدمیوں کا نقصان کر ڈالا۔ آصف جاہ اپنی بہن کی [illegible]
قوت سے ضرور کوئی ایسا کام لینا چاہتے ہیں جو حضور عالی کو خطرہ میں ڈالدے واللہ
انکی قوت کو توڑنا حضور عالی کا سب سے بڑا فرض ہے۔ بادشاہ چونکہ
اسوقت ایک عجیب کشمکش کے عالم میں گرفتار تھا اسکی سمجھ میں یہ بات آگئی

اور مہابت خاں کے کہنے سے نور جہاں کو قسمیں دے کر بلوا بھیجا۔
نور جہاں گو غصہ اور انتقام کی آگ سے برافروختہ ہو رہی تھی تاہم بادشاہ کی
بیوی تھی۔ اور اسکے احکام سے سرتابی ناممکن تھی لہذا کچھ خیال کر کے وہ تنہا
چلی آئی اور ایک الگ خیمہ میں فروکش ہوئی۔

مہابت خاں نے جہانگیر سے کہا کہ اب اچھا موقع ہے حضور نور جہاں کے
قتل کا حکم دیدیں تاکہ موجودہ سازشوں کا سدباب ہو جائے اور بندگان عالی
کو [illegible] نصیب ہو۔ بادشاہ نے جبراً قہراً اقتضائے وقت سے مجبور
ہوکر نور جہاں کے قتل کا محضر نامہ لکھدیا اور مہابت خاں کے حوالے کیا
مہابت خاں نے ایک خواجہ سرا کو بلایا اور وہ محضر نامہ دیکر کہا کہ نور جہاں کے
خیمہ میں جاؤ اور یہ حکمنامہ دکھا کر واپس آؤ جب خواجہ سرا نور جہاں کے خیمہ
میں پہنچا اور وہ شاہی محضر نامہ دکھایا تو نور جہاں کا خون خشک ہو گیا اسکے
ہاتھ کے طوطے اڑ گئے اور قتل و ہلاکت کی تصویریں اوسکی نگاہوں کے سامنے
[illegible] اور حوصلہ کو آخر وقت تک ہاتھ سے نہ دیا
[illegible] سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے"
مگر اتنا ضروری چاہتی ہوں کہ ایک مرتبہ حضور کے دیدار فیض آثار سے مشرف
ہولوں اوس کے بعد مجھے قتل کر دیا جائے۔

جب یہ تحریر حضور بادشاہ میں پہنچی تو مہابت خاں نے اسکے نہ ملنے پر اصرار
کیا بادشاہ پر اپنی تنہائی اور بے بسی کی وجہ سے کچھ ایسا رعب چھایا ہوا تھا
وہ اپنی تمام ہمراہیر اور شاہانہ دبدبہ کو بھولے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنے تخت سلطنت

سے دور تھا۔ لشکر اوس کے پاس موجود نہ تھا اور پھر اوسکے قبضہ میں سخت جس کو وہ تنفر کی نگاہوں سے دیکھ چکا تھا۔ کیا کرتا۔ مجبور تھا۔ مگر نورجہاں کی مایوسانہ تحریر میں کچھ ایسی محبت جھلک رہی تھی کہ اوسنے مہابت خاں کی منت وسماجت کرکے اوسے ملاقات پر راضی کر لیا۔ اور یہ شرط قرار پائی کہ جس وقت نورجہاں بادشاہ سے ملے مہابت خاں بھی وہاں موجود ہو۔

مختصر یہ ہے کہ نورجہاں اپنے خیمہ سے سکھ پال میں بیٹھ کر بادشاہ کے کمرہ میں آئی۔ اس کے کپڑے میلے ہو رہے تھے۔ بال پریشان تھے۔ چہرہ اوداس تھا۔ ہاتھوں میں سونے کی ہتکڑیاں پڑی ہوئی تھین۔ اس عالم مایوسی میں نورجہاں اپنے سرتاج کے سامنے آکر خاموش کھڑی ہو گئی اور ایک [illegible] انداز محبوب سے خدا جانے اوسنے کیا کہہ دیا کہ بادشاہ [illegible] میں آنسو بھر آئے اور وہ ہونٹھ چابکر اور سر جھکا کر دو منٹ کے لئے خاموش ہو گیا۔

پولیٹیکل دشواریاں کیسی سخت ہوں۔ مگر یہ ناممکن بات ہے کہ جو ہاتھ محبت کے ساتھ کسی گردن میں حمائل ہوں اور جو دل کسی زلف پریشان میں گرفتار ہو چکا ہو اوسی گردن اور زلف والے کے ساتھ وہی ہاتھ اور دل ایسا کام کریں جو دنیا سے محبت میں آج تک کسی نے نہیں کیا۔

نورجہاں کی بیکسانہ حالت اور اسکی گذشتہ عزت وعظمت اور اپنی محبت کا خیال کرکے جہانگیر رو دیا۔ اور مہابت خاں سے کہنے لگا کہ "میں نورجہاں

کے قتل کا حکم واپس لیتا ہوں۔ مہابت خاں نے بہت کچھ سمجھایا اور خیالات
بدلنے کی کوشش کی۔ مگر بادشاہ کے چھلکتے ہوئے آنسوؤں اور ابلتی ہوئی
آنکھوں کو دیکھ دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ اور سوائے اس کے اور کچھ نہ کہہ سکا
کہ حضور مختار ہیں جو چاہیں کریں۔

مہابت خاں گو اپنے جوش انتقام میں اندھا ہو رہا تھا تاہم وہ یہ ضرور سمجھتا تھا
کہ اگر شہزادگان سلطنت کو جہانگیر کے اس حال کا علم ہو گیا تو وہ فوراً فوج
کشی کر کے فوراً یہاں پہنچ جائیں گے۔ اور ذرا سی دیر میں کشتوں کے پشتے لگا
دیں گے چنانچہ یہی ہوا۔ کہ گو نورجہاں کی جان بخشی ہو چکی تھی۔ مہابت خاں کے
قصور معاف کر دئے گئے تھے۔ اور بادشاہ معہ تمام لشکر اور آصف جاہ و
نورجہاں لیسا [illegible] راجپوتوں کے نرغے میں مہابت خانی انتظامات کے تحت میں
[illegible] کابل کے قریب جا پہنچا تھا پھر بھی شاہزادہ خرم شاہجہاں ا
کمک لیکر اور دارا شکوہ اور رنگ زیب معہ چار فوجوں کے کابل جا پہنچے۔
ادھر نورجہاں نے اپنا لاکھوں روپیہ کا زیور فروخت کر کے افغانی فوج جمع کر لی
اور حکمران شہزادوں کو اپنا ہمراہ خواہ بنا لیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہانگیر مہابت خاں
کی نظر بندی سے محفوظ ہو گیا۔ اور مہابت خاں کا جوش انتقام درماندگی
و ناکامی سے بدل کر ہمیشہ کے لئے خاموش اور ٹھنڈا ہو گیا۔

آصف جاہی

اب جہانگیر کی تمام قوتیں ضعیف ہو چکی تھیں اور سلطنت کا تمام کاروبار آصف جاہ برادر نورجہاں کے ہاتھ میں تھا۔ جہانگیر کا یہ قول تھا "من سلطنت را بہ نورجہاں بیگم ارزانی داشتم بجز یک سیر شراب و نیم سیر گوشت مرا چیزے نباید" نورجہاں کی لڑکی جو شیر افگن کے صلب سے تھی اوسکی شادی جہانگیر کے شہزادے شہریار سے ہو گئی تھی۔ اور آصف جاہ کی لڑکی ارجمند بانو بیگم (ممتاز محل) شہزادہ خرم (شاہجہاں) سے منسوب ہو چکی تھی۔ جہانگیر کے دور سلطنت کا ستارہ قریب الغروب تھا اور جانشینان سلطانی میں خرم کی پیشانی پر بادشاہی درپردہ وہ بے پردہ ہو رہی تھی۔ نورجہاں چاہتی تھی کہ اپنے داماد کو تخت نشین کرے اور آصف جاہ چاہتا تھا کہ اپنے داماد کو تخت پر بٹھائے۔ اس جہد و جہد نے دونوں بہن بھائیوں میں نفاق ڈالدیا۔ افسوس مال و دولت اور سلطنت کی خواہش بھی کیسی بُری چیز ہے آصف جاہ نے نورجہاں کی اس برکت اور خوش نصیبی کو بھی دل سے بھلا دیا جسکی وجہ سے وہ آج دستور معظم اور آصف جاہ کہلانے کا مستحق ہوا۔ وہ اپنی بہن کے ان تمام حقوق و مراحم کو بھول گیا جو اس کی وجہ سے آصف جاہ کو پہنچے۔ اور درپردہ اوسکی امیدوں پر خاک ڈالنے کی کوشش کرنے لگا۔ نورجہاں نے بھائی کو بہت کچھ سمجھایا۔ مگر دولت پرستی نے اوسکی آنکھوں پر شکلوں کا پردہ ڈالدیا تھا۔ اور سلطنت کی دلکش تصویریں خوش

نصیبی کا رنگ جھلکتا نظر آتا تھا ادہر تقدیر اوسکے ساتھ تھی اور وعدے
کر رہی تھی کہ ہاں ہم شاہجہاں کو تخت سلطنت کا وارث کرینگے۔ اے کاش!
آصف جاہ اقسمت پہ شاکر رہتا وہ اپنی بہن کو اپنی طرف سے بدظن نہ کرتا
ہوتا وہی جو آگے چل کر ہوا۔ مگر نورجہاں اپنے ساتھ آصف جاہ کیطرف
سے بدگمانیاں لے گئی اون کی تلافی نہیں ہوسکتی۔

روضۂ ممتاز محل یا تاج گنج

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است وہمین است وہمین است

اس سے تو کون انکار کر سکتا ہے کہ نورجہاں کے بھائی آصف جاہ کو جو مناسب
جلیلہ اور مراتب عظیمہ سلطنت مغلیہ میں حاصل ہوئے وہ صرف نورجہاں کی وجہ
سے ہوئے۔ مگر پولیٹکل حقوق طلبی میں بالآخر نورجہاں پر اوس کے بھائی کو
جو فتح حاصل ہوئی۔ وہ اون تمام شکستوں سے زیادہ موثر تھی جو نورجہاں کو اوسکی
عمر گذشتہ میں نصیب ہوئیں۔ نورجہاں کی بھتیجی ممتاز محل شاہجہاں سے
منسوب ہونے کے بعد اور شاہجہاں کو تخت شاہی حاصل ہونے کے بعد ہر
عروج آصف جاہی مناصب کو حاصل ہوا اور نورجہاں اسی غم میں آخرکار گھلکر
مرگئی۔

یہ وہی ممتاز محل ہے جس نے مرنے کے بعد اپنے روضہ کی وجہ سے دنیا
میں حیات جاودان پائی اور نورجہاں سے زیادہ شہرت اسکے حصہ میں آئی۔

روضہ تاج محل آگرہ
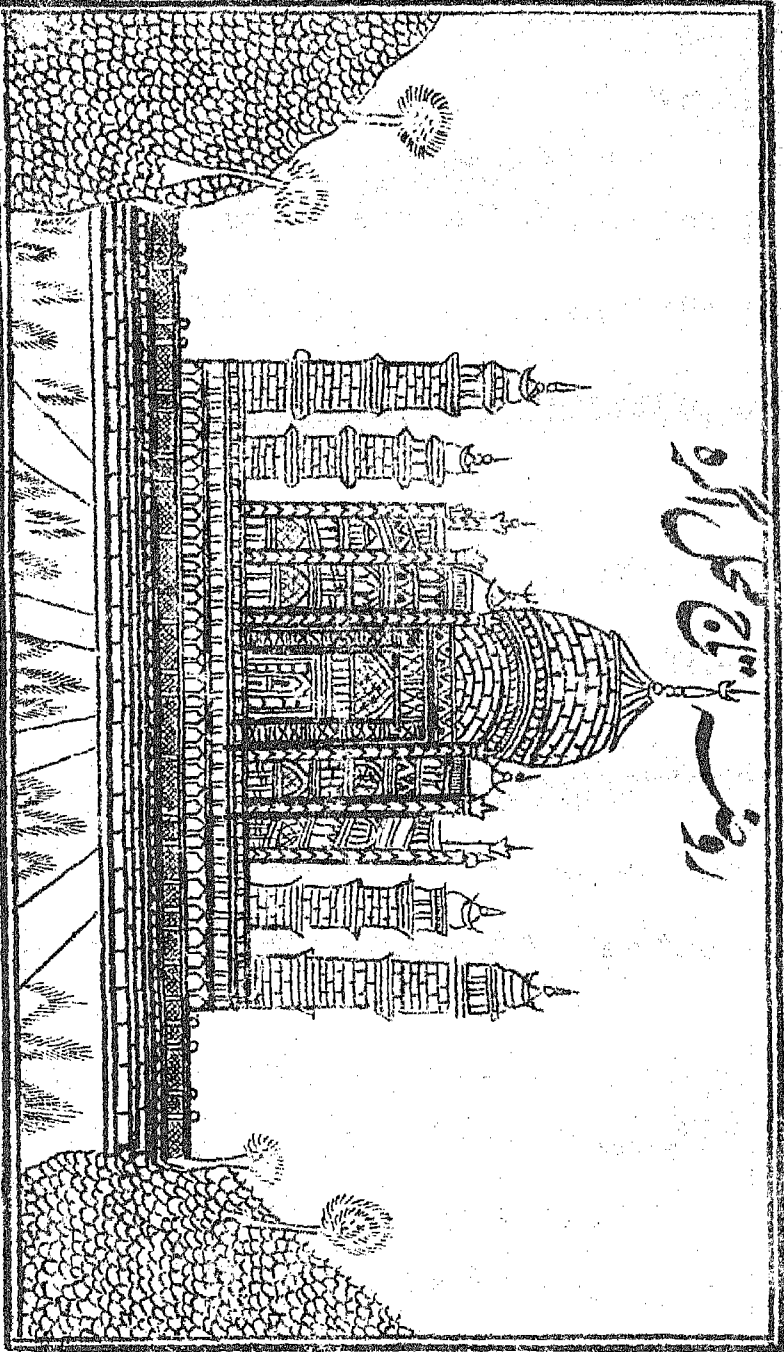
ممتاز محل کے مرنیکے بعد شاہجہاں نے کوشش کی کہ بڑے بڑے کاملان فن کو تعمیر روضہ کے لئے قسطنطنیہ اور بلاد عرب و عجم سے ہندوستان بلوایا اور سالہا سال کی مصروفیت کے بعد کروڑوں روپیہ صرف کر کے ممتاز محل کا روضہ بنوایا۔ جبتک روضہ کی تعمیر جاری رہی ممتاز محل کی لاش وہیں بیرونی حصہ صحن میں امانتاً سپرد خاک رہی اور بعد تکمیل تہ خانہ میں دفن کی گئی اوسکی قبر کے پہلو میں شاہجہاں نے اپنی قبر کے لئے بھی جگہہ چھوڑوا دی تھی اور حسب وصیت مرنے کے بعد وہیں دفن کیا گیا۔

روضۂ تاج گنج کی نزہت و بہار تو اوسوقت دیکھنے کے قابل ہوگی۔ جبکہ عہد شاہجہانی میں تزک و احتشام کے ساتھ اسکی رونقیں بڑھانیکا انتظام کیا جاتا تھا۔ مگر اب بھی تمام بہاریں لٹنے کے بعد جو پاکیزگی اور خوش اسلوبی روضہ کو حاصل ہے کسی دوسرے مدفن کو ہندوستان میں کبھی نصیب نہ ہوئی

گو اب روضہ میں میوہ دار درختوں کا پتہ نہیں تاہم گورنمنٹ برطانیہ کی کشادہ دلی نے اب بھی اوسکے مضافات اور متعلقات کو شاداب و سیراب بنا رکھا ہی سرسبز باغات اور چمن نے روضہ کی سفید دیوار برق عمارت کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ ایک طرف دریائے جمنا اوسکی دیوار کے نیچے حسرت و افسوس میں سر پٹک رہی ہے۔ اوسکے بلند مینار اپنی شوکت رفتہ کا پتہ دے رہے ہیں فوارے جو اب صرف اتوار کو چھوٹتے ہیں پھوٹ پھوٹ کر رونق ہائے گذشتہ کے لئے روتے ہیں۔ شاہی زمانہ کا ایک آدہ درخت اب بھی موجود ہے جو کسی کی زلف خمدار کیطرح بیسیوں خم کھا گیا ہے۔ اور اس کا ہر زخم

زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ میں نے شہزادیان سلطنت مغلیہ کے گیسوئے
دراز انہیں مضافات تاج میں بستہ اور کشادہ ، بیلچے ہوئے اور بکھرے
ہوئے مدتوں دیکھے ہیں۔ روضہ تاج گنج دنیا کی سات عجائب و غرائب
چیزوں میں سے ایک مان لیا گیا ہے ۔ یورپ کے سیاح جو ہندوستان
آتے ہیں اس سر بفلک عمارت کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ
جاتے ہیں۔

چاندنی رات میں یہ سنگ مرمر کا نورانی روضہ چشم نظارہ میں جنت الفردوس
کا ٹھنڈا اور سہانا سماں پیدا کر دیتا ہے۔ محرابوں پر بخط نسخ آیات قرآنی کندہ
ہیں جنہیں یہ صنعت تحریر رکھی گئی ہے کہ حروف کی جسامت دور و نزدیک سے
یکساں نظر آتی ہے ۔ روضہ کی عالی شان عمارت دیکھ کر عقل چکراتی ہے کہ
جن لوگوں نے اس روضہ کو تعمیر کیا ہے وہ اپنے فن میں کیسا ید طولیٰ رکھتے تھے
منبت کاری کا کام دیکھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر حصہ تاج اور ہر پتھر ڈھال
ڈھال کر اپنی جگہ پر رکھا گیا استحکام ایسا کہ سینکڑوں برس سے شکست
وریخت سے عمارت روضہ بری ہے اور ایسی ہی پری بنی کھڑی ہے۔
جابجا حوض ، حوضوں میں رنگ برنگ کی مچھلیاں ، مسجد ، ہشت نشین ، ما
وغیرہ ایسے دلکش نظارے ہیں کہ زباں سے بے اختیار داد نکلجاتی ہے۔
یوں تو ہر سیاح نے روضۂ تاج گنج کی سیر سے لطف نظارہ اٹھا کر اپنے
مقدور اور لیاقت کے موافق اسکی تعریف میں رطب اللسانی کی کسی نے اسے
"رونق روئے زمین" قرار دیا کسی نے "جنت ہندوستان" لکھا مگر جیسی انتہائی تعریف

لیڈی کرزن نے سیر کیوقت تاجگنج کی کی وہ اپنے جذبات کی جاذبیت اور
اپنے صداقت آفرین الفاظ کی سلاست کی وجہ سے مستغنی از تعریف ہو گئے ہیں
کہ لیڈی کرزن نے جب پہلے پہل روضہ کو دیکھا تو اسکی زبان سے بے اختیار
یہ الفاظ نکل گئے کہ "اگر مجھے یقین ہو کہ میرا شوہر میری قبر پر بھی ایسا ہی روضہ
بنوا دیگا۔ تو میں اسی وقت جان دینے کو تیار ہوں"

خموش اے لطیف الخیال خاتون خموش۔ دیکھ ممتاز محل، اپنی تمام شوکتوں
اور دل آرائیوں کے ساتھ مجملہ مدفن میں کھڑی ہوئی کہہ رہی ہے کہ

"اگر میں دوبارہ زندگی پاؤں اور مر جاؤں تو بھی اب ایسا دلکش روضہ
صفحۂ دنیا پر دست انسان سے تعمیر نہیں ہو سکتا"

بیشک! تاجگنج اپنی مجموعی حیثیت سے سلاطین مغلیہ کی فہم و فراست اور
ازمنۂ قدیم کی صنعت کی ایک ایسی یادگار ہے جو کبھی فنا نہیں ہو سکتی اور
جسکا جواب دنیا میں پیدا نہیں ہو سکتا ؎

اے یادگارِ رفتگاں — اے روضۂ جنت نشاں
اے روضۂ گردوں حشم — اے جنتِ ہندوستاں
ہر گوشہ گوشہ تیرا ہے — آرام گاہِ قدسیاں
ڈھالا ہے سانچے میں تجھے — اے مرقدِ شاہِ جہاں
اے قبر تیری گود میں — سوتا ہے اک خلد آشیاں
تیرے مجمر کی بنا — جیسے فرازِ کہکشاں
جیسے ستاروں کی چھت — بدن تیری پرچیں سازیاں

ہر کتبے سے ہے جلوہ گر — طغرا نویس کن فکاں
افشاں ترخ قدرت ہو یہ — یا ہیں یہ بہشت کاریاں
وہ جالیاں ہیں دلربا — یا چشمک حور جناں
آنکھوں نے دیکھا ہی نہیں — ایسی تجلی کا مکاں
ہے منحصر نظارہ پر — تیری حقیقت کا بیاں
سرمایۂ صد ناز ہے — روضہ ہے یا اعجاز ہے

وفات جہانگیر

جہانگیر کو جہاں اور شوق تھے وہاں شکار کا بھی بیحد شوق تھا۔ اور وہ شکار کھیلنے کے لئے اکثر مضافات کشمیر میں آتا تھا۔ کشمیر کے دلکش مناظر اوسکے دل کو بہت ہی بھلے معلوم ہوتے تھے اور وہ چاہے کیسے ہی مہمات میں مصروف ہو مگر سیر کشمیر سے دل فارغ نہ ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ کشمیر سے واپسی پر جہانگیر بارہ مولا کے قریب بیرم کلہ کے مقام پر شکار کھیل رہا تھا نورجہاں ساتھ تھی اتفاقاً ایک حسین لڑکا جو ہرنوں کو ڈرانے کے لئے پہاڑی پر چڑھا ہوا تھا پاؤں پھسلنے کی وجہ سے لڑھکا اور پہاڑی کے دامن میں آتے آتے جان دیدی۔

جہانگیر کے دل پر اس واقعہ کا بیحد اثر ہوا وہ شکار چھوڑ کر سیدھا حرم سرا کو چلا آیا مگر اس لڑکے کے خیال نے اوسے بیحد تکلیف دی اور دمہ کی ریح ضعیف ہوتی چلی گئی۔ اور چار پانچ ہی روز میں سنہ ۱۰۳۷ھ مطابق سنہ ۱۶۲۷ء انتقال فرمایا

ملا کشفی سنہ جو جہانگیر کے دربار میں ایک ممتاز شاعر تھے وفات جہانگیر کی تاریخ حسب ذیل کہی ہے۔

چو تاریخ وفاتش جست کشفی — خرد گفتہ جہانگیر از جہاں رفت

نورجہاں عالم بیوگی میں

ناظرین اس حیرت انگیز حالت کو ذرا غور سے دیکھیں کہ وہ ہی نورجہاں جو ہزاروں بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی مادر مہربان کیطرح سرپرستی کرتی تھی آج خود عالم بیوگی میں ہے اوسنے ہر قسم کا سنگھار کرنا چھوڑ دیا ہے سفید کپڑے پہنے رہتی ہے اوسکے گلاب سے رخسار مرجھا گئے ہیں اور وہ چمنستان حسن کی ایک مرجھائی ہوئی کلی معلوم ہوتی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

ادہر تو جہانگیر کے انتقال کی خبر قلعہ معلی میں آئی ادہر آصف جاہ نے نورجہاں کی نظر بندی کا حکم دیدیا اور شہزادہ خرم (شاہجہاں) کو خبر بھیجی کہ جلد سے جلد آکر سلطنت کی عنان اپنے ہاتھ میں لیں۔ چنانچہ ۳۶ برس کی عمر میں شہاب الدین محمد شاہجہاں بادشاہ، داماد آصف جاہ، سریر آرائے سلطنت ہوگئے اور نورجہاں کے ارمان دل کے دل ہی میں رہ گئے۔

شاہجہاں نے نورجہاں کو بڑے احترام اور بڑی عزت سے رکھا لیکن نورجہاں اتنی بڑی پولیٹیکل شکست کے بعد کیونکر گوارا کر سکتی تھی کہ کامیاب مخالفین میں رہکر اپنی باقی ماندہ زندگی بسر کرے اوس نے کہا کہ میں پنجاب میں رہونگی شاہجہاں نے اسے بھی بخوشی منظور کر لیا۔ اور پچیس لاکھ روپیہ سالانہ

مقرر کر کے نورجہاں کو لاہور بھیجدیا اور اوس کا بھائی دوا ابوالحسن یمین الدولہ آصف جاہ کے خطاب سے سرفراز کیا گیا اور منصب نہ ہزاری پر مامور ہوا نورجہاں لاہور کو بیحد پسند کرتی تہی۔ چنانچہ اس شعر سے اوس کے خیالات کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے ؎

لاہور را بجاں برابر خریدہ ایم　　جاں دادہ ایم و جنت دیگر خریدہ ایم

مسعود سوداگر

ہمارے ناظرین کو تعجب ہوگا کہ سوداگر نورجہاں کو جنگل سے اوٹھا کر لایا تہا اور جس نے اس لعل بے بہا کو اکبر کے سامنے نذر کیا تہا اوسکا کیا حشر ہوا ہم اسکے متعلق مختصر حالات بیان کر کے اس سوانح عمری کے باقی ماندہ حصہ کو انشاء اللہ بہت جلد ختم کرتے ہیں۔

مسعود قافلہ سالار ایک سوداگر تہا جو ایران میں رہتا تہا۔ اور وہاں کی بیش بہا چیزیں بطور نذرانہ اکثر دربار شاہی میں لایا کرتا تہا جب مرزا غیاث کو اوسنے شہنشاہ اکبر کے دربار میں پہنچایا تو اوسکی رسائی اور بہی زیادہ ہوگئی۔ اسکے بعد بہی وہ اکثر آتا جاتا رہا نورجہاں اوسے "عنصر بابا" کہا کرتی تہی۔

نورجہاں کے والدین اوس کی بہی عزت و عظمت کیا کرتے تھے۔ جب مرزا غیاث دیوان بیوتات شاہی ہوگئے تو چاہا کہ مسعود کے احسانات کا کچھہ صلہ ادا کر دیں لیکن شریف الخیال مسعود نے اسے گوارا نہ کیا۔ بلکہ اب اوس کی محبت و شفقت نے یہاں تک طول کھینچا تہا کہ جب وہ شہنشاہ

کے لئے تحفے لاتا کوئی بیش قیمت چیز نورجہاں کے لئے بھی ضرور لے کر آتا
جب نورجہاں بادشاہ بیگم ہوئی تو اتفاق سے مسعود انتقال کرچکا تھا مجبوراً
نورجہاں نے اوس کے لڑکے محمود کو ایران سے بلایا اور اسکے ساتھ
روپیہ کا سلوک کیا۔

وہ چاہتی تھی کہ محمود کو سلطنت میں کوئی اچھا عہدہ دلوا دے مگر محمود نے
ایران چھوڑنے پر نارضامندی کا اظہار کیا پھر بھی نورجہاں اوسے اکثر گھوڑے
ساز وسامان اور طرح طرح کے انعام واکرام دیتی رہتی تھی۔ اسی کے زیر
اہتمام اس نے صحرائے قندھار میں اوس موقعہ پر جہاں اوس کے والدین
پیدا ہوتے ہی چھوڑ آئے تھے ایک یادگار قائم کی۔ گنبد، سرائے اور کنواں
بنوایا کہ راہگیر جو اودھر سے گذریں نورجہاں کے قصے اور خدا کی قدرت
کو بھی یاد کریں۔

مسعود سوداگر کی قبر بھی پچاس ہزار روپیہ دیکر نہایت شاندار بنوا دی

نورجہاں کی وفات

ہر آنکہ زاد بہ ناچار بایدش نوشید ز جام دہر مے کل من علیہا فان

اللہ اللہ یا تو ایک وہ موقعہ تھا کہ نورجہاں کی بڑھتی ہوئی دولت اور چڑھتی ہوئی
جوانی کے عالم میں تصویریں کھینچ رہے تھے۔ یا ایک یہ موقع ہے کہ ہم سب
اس چاند سی صورت کو مٹی میں ملانے کا حال لکھتے ہیں۔ مگر یہ دن سب
کے لئے ہے کوئی کیسا ہی عالم فاضل، حسین، کامل، دولتمند، حکیم،

اور فلاسفر کیوں نہ ہو موت کا مزہ ضرور چکھیگا۔ کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

نورجہاں کی حشمت کا پانسہ اوسی وقت سے پلٹا جب سے کہ اوسکی ماں کا انتقال ہوا۔ وہ اوسی دن سے آلام پیہم میں گرفتار ہوتی چلی گئی۔ ادہر پولیٹیکل پیچیدگیوں نے اوسے اور بہی مایوس کردیا گو وہ قابلہ اور عاقلہ تہی مگر پہر بہی عورت تہی۔ مردوں کے سامنے اوسکی کیا چل سکتی تہی تاہم سیاسی عقدون کے سلجہانے میں جو کوشش بہی اوس نے کی وہ اُس کی صنف اور لطیف الجنسی کے لحاظ سے قابل قدر اور لایق رشک ضرور ہے

اُسکی آخر عمر میں اوسکے دلپر جو گہرا اور ناقابل اندمال داغ پڑا وہ جہانگیر کا انتقال تہا اور اسی کے ساتھ اوسکی ان خواہشوں کی پامالی جن کا تعلق شہزادہ شہریار ولیعہدی سے وابستہ تہا۔ وہ ممتاز محل کی اس خوش نصیبی کو جو اوسے آصف جاہ کی ریشہ دوانیوں سے حاصل ہوتی تہی ٹہنڈے دل سے نہیں دیکھ سکتی تہی اور اسی لئے اوسنے آگرہ میں رہنا بہی پسند نہیں کیا اور لاہور بسانا گوارا کیا۔ جہانگیر کے مرنیکے بعد بارہ برس تک نورجہاں اور زندہ رہی۔ اس مدت کو اوس نے دعا اور اوراد و وظائف میں گذارا رات دن خدا کی عبادت میں مصروف رہتی تہی اور جہانگیر کی مغفرت کیلئے دعائیں مانگتی تہی۔

مگر اس عالم میں بہی وہ اُن بے کسوں کے حال سے بیخبر نہ رہی جن کی وہ اپنے سہاگ کے زمانہ میں خبرگیراں تہی۔ اور اپنی جائداد کا ایک حصہ انکی سرپرستی کے لئے مستقلاً وقف کردیا۔

آخر ۱۶۴۵ء میں ایک دن عصر کارواں سرائے عالم سے رخصت ہو گئی ؎

روح نے یوں کہا دمِ رخصت
یہ نتیجہ ہے زندگانی کا

کفن

نور جہاں نے اپنے کفن کا انتظام اپنی زندگی ہی میں کر لیا تھا - وہ حریر سپید کا بنا ہوا تھا اور اصفہان میں خاص طور پر تیار کیا گیا تھا۔ آیات قرآنی اس میں بنوائی گئی تھیں۔ مکہ معظمہ بھیج کر آبِ زمزم سے اسے دھلوایا تھا۔ حرم محترم، مدینہ منورہ، نجف اشرف، کربلائے معلیٰ اور مشہد مقدس وغیرہ مقامات کی خاک سے کفن پر خدا کے ۹۹ نام، چودہ معصومین علیہم السلام کے نام، اور دعائے مغفرت لکھی گئی تھیں۔ اس کفن کے لئے اس نے ایک خاص داروغہ مقرر کیا تھا۔ اس پر ہر روز قرآن شریف پڑھ کر دم کیا جاتا تھا۔ اور نور جہاں کی قبر میں کربلائے معلیٰ کی مٹی بچھائی گئی تھی۔

جنازہ

نور جہاں کے جنازہ کے ساتھ ساٹھ ہزار آدمی تھے۔ اور مرنے کے بعد بھی شاہانہ جبروت و جلال اور عظمت و وقار اس قدر ہویدا تھا کہ لوگ جنازہ کی طرف بمشکل دیکھ سکتے تھے ہزاروں غریب مسکین، اندھے، لولے، لنگڑے، یتیم، بیمار، چلا چلا کر رو رہے تھے۔ جنازہ کے ارد گرد یتیم بچوں کا حلقہ تھا اس منظر کو جو دیکھتا تھا دل تھام لیتا تھا کوئی آنکھ خشک نہ تھی اور نہ کوئی دل ساکن

تھا ملا محمد ہروی لکھتے ہیں کہ جب نورجہاں کے انتقال کی خبر پہنچی تو میں نے خیال
کیا کہ وہ شیعہ تھی اسلئے غالباً اسکے جنازہ کے ساتھ صرف شیعہ لوگ ہونگے
لیکن جب بغرض شرکت وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ شیعوں سے چار حصہ زیادہ سنی
شریک جنازہ ہیں۔ اور قاضی شہر بھی بچشم گریاں ہمراہ ہیں۔
آگے موصوف لکھتے ہیں کہ سرمست شاہ قلندر کبھی نماز نہیں پڑھتے تھے لیکن
نورجہاں کے جنازہ کی نماز انہوں نے صفوں سے علیحدہ ہو کر ادا کی۔ اور
سجدہ کیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ حضرت مردے کی نماز میں سجدہ کیسا۔ فرمایا کہ
"خدائے زندہ را گو نماز گذرانده ایم" اور فرمایا کہ نورجہاں کے لئے یتیم بچوں
کے آنسو بہشت میں محل بنوا رہے ہیں۔ بیوہ عورتوں کے اشک مسلسل
لعل و یاقوت کے قصر تیار کر رہے ہیں۔ غریب اور لاچار لوگوں کی دعائیں
ان محلوں کا ستون بن رہی ہیں۔ اور خدا کی رحمتیں نورجہاں کی
یتیم پروری اور بیکس نوازی کا معاوضہ دینے کے لئے تیار ہیں۔

مزار

القصہ نورجہاں کا جنازہ بندوں کی دعاؤں اور خدا کی رحمتوں میں گھرا ہوا
شاہدرے پہنچا، اور وہاں قبرستان جہانگیر کے جوار میں دفن کیا گیا۔
منشی محمد الدین صاحب فوق لاہوری مقبرہ نورجہاں کی موجودہ حالت
کا فوٹو ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔
"نشۂ عیش میں سرشار رہنے والے عیش پرستو، رعونت و تکبر کی شراب سے

بدمست ہونیوالے غافلو، موت کے خوف اور خدا کی یاد سے غافل رہنے والے
غافلو، موت کے خوف اور خدا کی یاد سے غافل رہنے والے نوجوانو، عارضی حسن
پر ناز کرنے والے حسینوں تو بھی کے ان لفظوں کو مجذوب کی بڑ نہ سمجھو، دیکھو
اور سنو، یہ دنیا فانی ہے تم بھی اسے فانی سمجھتے رہو۔ مگر کام ایسے کرتے ہو
گویا تمہیں موت کبھی آنی ہی نہیں۔ نورجہاں کی طرف ہی دیکھو اسکی
شان وشوکت اوسکا رعب وجلال اوسکا حسن وناز آج کہاں ہے
وہ نورجہاں جس نے جہانگیر کی چاہتی ملکہ بنکر حرم سرائے شاہی میں تمام رانیوں
کے چراغ بے نور کردیئے تھے مگر آج خود ایک مٹی کے چراغ کو ترس رہی ہے ؎

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ آید نے صدائے بلبلے

نورجہاں کا مقبرہ دیکھ کر کوئی سنگدل ہوگا جس کے دل سے آہ، زبان سے
آف، اور آنکھوں سے آنسو نہ نکل آتے ہوں۔ افسوس نورجہاں کی قبر
جسکے ہاتھ میں حکومت ہندوستان کی باگ تھی۔ آج چیونٹیوں کا مامن و مسکن
ہے مقبرہ کی ٹوٹی ہوئی عمارت جسے بارہ دری کہتے ہیں چرواہے لڑکوں
اور گائے بھینسوں کیلئے گرمی کے دنوں میں سائباں کا کام دیتی ہے نورجہاں
کا مقبرہ عین اوس ریلوے سڑک پر واقع ہے جو لاہور سے وزیر آباد کو جاتی
زمین کے احاطہ میں قبر کا تعویذ ہے۔ قبر دراصل زمین دوز ہے ایک
سُرنگ نورجہاں کے مقبرہ سے جہانگیر کے مقبرہ تک جاتی ہے جس میں
آج کل کوئی متنفس ہی نہیں جاسکتا۔

ہم اسپر اسقدر اور اضافہ کرتے ہیں۔

نورجہاں باعتبار علم وفضل تدبیر وفہم وادراک ودانش ہندوستان کی بیگمات میں
اس قابل تھی کہ اوسکے مسلک علم ودانش کی تقلید کیجاتی ہماری خواتین اوسکے
کارناموں سے عفت وعصمت، حلم وضبط، صبر وشکر، اور احتیاط کے سبق
لیتیں لیکن خیر اب نئی روشنی کا دور دورہ ہے خواتین ہندوستان میں علم
کے چرچے تو بیشک ہورہے ہیں مگر عملاً دیکھا جائے تو کچھ بھی نہیں۔ اگر آج
شاہی زمانہ ہوتا تو غالباً بیگمات شاہی کے مزاروں کی یہ ناگفتہ بہ حالت
نہ ہوتی جو آج کل مزارات زیب النسا اور نورجہاں بیگم کے متعلق سننے میں آرہی
ہے۔ مگر اب جس سلطنت کا دور دورہ ہے وہ بھی آثار قدیمہ کے تحفظ میں کچھ
کم کوشاں نہیں ہے ہم اُسے بھی متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ جسطرح وہ آگرہ میں تاجگنج
اعتماد الدولہ اور سکندرہ وغیرہ کی مرمت وحفاظت میں دلچسپی لے رہی ہے اسیطرح
ان بیگمات اسلام کے مزارات مقدسہ کیطرف بھی نظر مراحم ڈالے اور ان کی
شکست وریخت کا کوئی کافی انتظام کرے زیادہ ہنسی تو ہمیں اپنی قوم کی لا
پرواہی اور تغافل پر آتی ہے جب مزار نورجہاں ریلوے سڑک پر واقع ہے تو
ہزاروں مسلمان روزانہ اس مزار کی ناگفتہ بہ حالت کو دیکھتے ہوئے چلے جاتے ہونگے
پھر کیا یہ اسلامی حمیت ہے کہ معمولی مزاروں کی مرمت کیطرف تو اسقدر توجہ
دیجاتی ہے اور مزار نورجہاں کیطرف کوئی نظر اوٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔
ہندوستان میں تعلیمیافتہ خواتین کی کچھ کمی نہیں ہے۔ اگر وہ بھی اپنے طبقات
وسیع میں دامے درمے چندہ کرکے بیگمات شاہی کے مزاروں کی حفاظت

ترصیع کا خیال کریں تو یہ مشکل کام بہت جلد آسان ہو سکتا ہے مگر کوشش اور توجہ کی ضرورت ہے۔ لاہور جہاں کا مقبرہ ہے، خود ہی ایسے ایسے صاحبان دولت وجاہ کا مسکن و مرکز ہے کہ اگر ان میں سے کوئی ایک کھڑا ہو جائے تو کم از کم موجودہ منظر کو ضرور بدل سکتا ہے۔ ہمارا مقصد یہ تو ہے نہیں کہ اسپر تاج گنج یا اعتماد الدولہ کی طرح ایک عالی شان نظر فریب عمارت قایم کی جائے۔ یا اسکے لئے عرب و عجم اور قسطنطنیہ سے انجنیر وغیرہ بلوائے جائیں بلکہ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ مزار نور جہاں جس کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہے وہ حالت بدل جائے اور دیکھنے والوں کے دلوں پر کسی بے چارگی ویرانی کا احساس نہ ہو۔

سب سے بڑا رونا یہ ہے کہ لاہور کے اخبارات محکمہ آثار صنادید کو مزار نور جہاں کی طرف کبھی توجہ ہی نہیں دلاتے۔ کیا اسلامی ہمدردی کا ثبوت یہی ہے۔ اگر لاہور کے مسلم اخبارات کوشش کریں تو دنیا بھر سے تعمیر مزار کے لئے چندہ کر سکتے ہیں۔ لیکن کوشش کرنا ہی تو ایک بڑی بات ہے۔

مزار نور جہاں کی موجودہ حالت "تصویر عبرت" کے عنوان سے جناب مولوی حبیب الرحمان صاحب حسرت شروانی نے ہیکل پر سے خوب کھینچی ہے۔ جو بجنسہ پیش کیجاتی ہے ؎

بزم اک لاہور میں ہے خادمان قوم کی — جنکے دل سے لگ رہی ہے فکر شان قوم کی
رات دن سرگرم سب کے سب اسی کوشش میں ہیں — جسطرح ممکن ہو پہنچے اسلام کی خدمت کریں
حسرت بیدل بھی انکے شامل محفل ہوا — رنگ محفل سے سرود بیکراں حاصل ہوا

بلبلانِ قوم کے بھی پیچھے سب سُن لئے — شہر خاموشاں میں جا نکلا میں عبرت کیلئے

پھرتے پھرتے مرقدِ نورجہاں آیا نظر — مقبرہ تھا وہ کہ تھا تصویرِ عبرت سربسر

کل تھا جسکی شان پر عالم کا دل آیا ہوا — آج عالم بیکسی کا اوسپہ ہے چھایا ہوا

جسکے سلطنت کو مانگتا تھا بادشاہ روزگار — گردشِ گردوں سے یوں تاراج ہوا اسکا مزار

چوٹ سی دلپر لگی اُجڑی وہ حالت دیکھکر — جان ہی پر آبنی بگڑی وہ صورت دیکھکر

[illegible] غفلت کا پردہ اٹھ گیا — بیخودی نے مجھکو دکھلایا تماشہ اک نیا

[illegible] استادہ با فرشتہ — جو عجب حسرت سے روضہ کیطرف تھی دیکھتی

اوسکی پیشانی سے رعبِ سلطنت تھا جلوہ گر — اوسکی چتون سے برستا تھا غضب کا کروفر

دل نے آہستہ کہا یہ ہے جہانگیر غیور — مقبرہ میں سو نہ والی اسکے دلکی تھی سرور

دیر تک تو ضبطِ بیتابی دل کرتی رہی — جوشِ بیتابی سے وہ مجبور آخر ہو گئی

[illegible] اوسنے بادلِ اندوہ گیں — یوں کیا اظہار درد دل بہ آوازِ حزیں

[illegible] کا ہے یہ خوار خستہ مقبرہ — برسوں ڈنکا جسکا ملکِ ہند میں بجتا رہا

جسنے جسکے سر پہ قربان چترِ شاہی کردیا — جسکی جوتی کے تلے اورنگ شاہی کردیا

جسکے قدموں پر فدا کردی تھی جسنے سلطنت — جسکے آگے سر جھکا دینے تھی اہلِ مملکت

جسکی صورت جلوۂ فردوس کی تصویر تھی — جسکی رنگینی بہارِ خطۂ کشمیر تھی

آہ وہ ایامِ عشرت آہ وہ لیل و نہار — بلبل آملِ چہکتا ، دیکھ کر جس کی بہار

لہ مسٹر جیمس ڈگلاس اپنی تصنیف "بمبئی اور مغربی ہند" میں نورجہاں سے متعلق لکھتے ہیں "دن میں وہ ایک بیل گاڑی میں بیٹھ کر شہر کی سیر کرتی تھی اور رنگین مزاج جہانگیر اسکا گاڑی بان ہوتا تھا"

جسکی رنگین بزم رشکِ روضۂ فردوس تھی
بیکسی سے اوسکے روضہ کی ہی کیا صورت بنی

ظالموں نے قبر کا تعویذ تک چھوڑا نہیں
کونسا گوشہ ہو تربت کا کہ جو توڑا نہیں

بذلہ سنجی سے مجمل ہوتی تھی جسکی بیٹھک ہی
حیف وہ خاموش آغوشِ لحد میں ہی پڑی

قصر میں بچھتا تہا جسکے فرشِ دیبا و حریر
آہ فرشِ خاک پہ سوتی ہے وہ ماہ منیر

جھمگٹے میں نازنینوں کے جو کرتی تھی بسر
آہ اوسکی قبر پر اب بیکسی ہے نوحہ گر

سیج پر پھولوں کے سوتی تھی کبھی وہ نازنیں
پھول دو سوکھے ہی اسکی قبر پر چڑھتے نہیں

جسکی پابوسی کی کرتے آرزو گلہائے تر
خشک کانٹوں کا پڑا ہے ڈھیر اوسکی قبر پہ

حسن جسکا تازگی بخشِ گلِ گلزار تھا
آہ قسمت میں لکھا اوسکے لحد کے خار تھا

قصر میں جلتی تھیں جسکے شمعہائے عنبریں
حیف روشن اک دیا بھی قبر پر اوسکی نہیں

نام روشن ہے جہاں میں آہ جسکا سربسر
نام کو بھی روشنی آتی نہ اوسکی قبر پر

کر دئے جس نے بہت سے صاحبِ طبل و نشان
اس شکستہ مقبرہ میں پڑی ہے بے نشان

جسنے صدہا خلعتِ دیبا و اطلس دیدئے
حیف ترسے اسکی تربت ایک چادر کیلئے

لونڈیوں پہ جسکی تھی پوشاک کل زربفت کی
آج دیواریں ہیں اسکے روضہ کی ننگی کھڑی

تمام شد

۱۵۹۵۱